راہی اور راہ نما
از
سید الطاف علی بریلوی

راہی اور راہ نما

از

سید الطاف علی بریلوی
بی ۔ اے (علیگ)

ایڈیٹر "العلم"، مصنف "حیاتِ حافظ رحمت خاں"،
"مسلمانوں کی تعلیمی جدوجہد" اور "طالبِ علم کی ڈائری" وغیرہ۔

اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔ کراچی۔

۱۹۶۴ء

ناشر
ڈائرکٹر اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ
آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

سعیدہ منزل۔ متصل سرسیّد گرلس کالج
ناظم آباد۔ بی روڈ۔ کراچی۔

طبع اوّل

تعداد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ہزار
قیمت ۔ [illegible]

مطبوعہ
ایجوکیشنل پرنٹنگ پریس۔ کراچی
۱۹۶۴ء

بہ نامِ نامی
جناب ممتاز حسن صاحب منیجنگ ڈائرکٹر
نیشنل بنک آف پاکستان

جنکی
علم دوستی اور معارف پروری قدم قدم پر میری شمعِ راہ رہی ہے

سکۂ اقبال بنامِ تو باد
ہرچہ بگیتی ست بکامِ تو باد

عقیدت کیش
سید الطاف علی بریلوی

فہرست مضامین

(باعتبار سنہ تحریر)

صفحہ

٠- پیش لفظ ...... مصنّف ۷

۱- قائد اعظم ۱۳

۲- ڈاکٹر ذکی الدین ۳۱

۳- پروفیسر ستار خیری ۳۴

۴- میرا بیٹا شاہد ۳۶

۵- شہید ملت ۴۱

۶- علامہ سید سلیمان ندوی ۵۹

۷- حکیم شریف الزماں ۶۶

۸- صاحبزادہ شہزاد احمد خاں ۶۸

۹- علامہ عبداللہ یوسف علی ۶۹

۱۰- مولوی مسعود عالم ندوی ۷۱

۱۱- قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی ۷۲

صفحہ

۱۲- مولانا ظفر علی خاں ... ۱۴۲

۱۳- چودھری محمد اطہر ... ۱۴۵

۱۴- ڈاکٹر عبد الغفور بسمل ... ۱۴۶

۱۵- بابائے اُردو ... ۱۵۵

۱۶- مولانا عبد المجید سالک ... ۱۶۶

۱۷- محمد چاؤش ... ۱۷۰

۱۸- مولوی شوکت علی خاں ... ۱۹۱

۱۹- سید برکات احمد (علیگ) ... ۱۹۳

۲۰- ڈاکٹر عباد الرحمن خاں و مقصود حسین خاں ... ۱۹۵

۲۱- جگر مراد آبادی ... ۱۹۸

۲۲- مولوی حبیب اللہ خاں ... ۲۰۲

۲۳- راجہ صاحب سلیم پور ... ۲۰۴

۲۴- مولانا سید طفیل احمد منگلوری ... ۲۰۵

۲۵- ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی ... ۲۲۷

۲۶- ڈاکٹر محمد شفیع ... ۲۴۲

۲۷- ڈاکٹر ہادی حسن و مولوی سلیمان بدایونی ... ۲۴۴

۲۸- ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد ... ۲۴۶

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

(از مصنف)

موجودہ ہوائی اور جمہوری دور میں افراد کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ سماجی عمل ارتقا نے ہر انسان کو وہی اہمیت دیدی ہے جو کسی زمانہ میں بڑے بڑے شہنشاہوں، جنگجوؤں، مدبروں اور فلاسفروں وغیرہ کو حاصل تھی۔ ایک وقت تھا کہ صرف عظیم المرتبت اور گرانمایہ شخصیتوں کا ہی حق سمجھا جاتا تھا کہ اُن کی یادگاریں قائم کی جائیں۔ ان کے افکار و اقوال کو جمع کیا جائے اور اُن کی سوانح عمریاں ضبطِ تحریر میں لائی جاتی تھیں۔ ایک عام آدمی میں کوئی ایسی بات خیال نہ کی جاتی تھی کہ اُسے کسی اعتبار سے قابلِ اعتنا متصور کیا جائے۔

یہی سبب ہے کہ ساری دنیا میں بڑے بڑے مقبرے اور دوسری یادگار عمارتیں نیز خود نوشت یا اوروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں زیادہ تر نامور لوگوں کی پائی جاتی ہیں اور اُس کے مقابلے میں کروڑوں افراد گمنامی کی گہری تاریکیوں میں مستور ہیں۔

دُنیا میں غالب اکثریت عوام کی ہے جن کے مسائلِ حیات بڑے لوگوں سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ اُن کے لئے ذی مرتبہ صاحبان کے حالات کس کام کے؟ زیادہ سے زیادہ وہ ابطال و عجائب پرستی اور ذہنی آسودگی کا سامان بہم پہنچائیں، تو پہنچائیں زندگی کی اُن مشکلات سے جو غریبوں اور مجبور و لاچار لوگوں کو پیش آتی ہیں، با اختیار، فارغ البال اور خوش نصیب اصحاب کو کیا واسطہ؟ لہٰذا آخر الذکر طبقہ کے کوائف و حالات اوّل الذکر کے لئے نہ کارآمد ہو سکتے ہیں اور نہ قابلِ تقلید!

مکان۔ لباس۔ اشیائے خورد و نوش کی فراہمی اور اولاد و متعلقین کی تعلیم و تربیت نیز شادی بیاہ کے فرائض سے سبک دوشی جہاں ایک جماعت کے لئے معمولی اور آسان کام ہیں وہاں دوسرے انسانوں کے لئے انتہائی سخت اور جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ پوری پوری زندگی کی صبر آزما ریاضتوں کے بعد چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں —— اور وہ بھی اکثر حالتوں میں نہیں ہو پاتیں —— اور انجام کار یونہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر حیاتِ مستعار ختم ہو جاتی ہے۔

ایسے حالات میں مناسب یہ ہے کہ اقلیت کے بجائے زیادہ تر اکثریت کے مصائب و آلام اور روزمرہ پیش آنے والے مسائلِ زندگی کے عین مطابق واقعات —— سیدھے سادے انداز میں قلم بند ہوں اور دکھایا جائے کہ ایک غریب و متوسط الحال انسان کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ وہ کن کن حوادث کا شکار ہوتا ہے؟ کس درجہ فطری قوتِ مدافعت اُس کا

ساتھ دیتی ہے؟ اور کس کس منزل پر امکانی جد و جہد کے باوصف وہ ناکامی و نامرادی کا مُنھ دیکھتا ہے؟

ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ناسازگار اور ناموافق حالات کے ہوتے ہوئے ہمت و استقلال، دیانت داری، وضع داری، وفا شعاری اور خدا ترسی کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ چنانچہ اسی احساس کے تحت فی زمانہ شخصیت نگاری اور افسانہ نگاری کے لئے کرداروں کے انتخاب میں کسان۔ مزدور۔ غریب طالب علم۔ آرٹسٹ۔ فاقہ مست شاعر۔ مفلوک الحال مصنف اور اخبار نویس۔ ادنیٰ تاجر۔ کثیر العیال کلرک اور اسکول ماسٹر۔ بیکس لڑکی۔ ضعیف باپ۔ بیوہ اور یتیم وغیرہ وغیرہ افراد مرکزِ توجہ بنائے گئے ہیں اور اُن کے ذریعہ معاشرہ کی بے لوث عکاسی کی جا رہی ہے۔

سماج کے چھپے ہوئے ناسُوروں سے اطلس و کمخواب کی پٹیاں ہٹا کر اُن کی اصل گھناؤنی صورت مشاہدہ کرائی جا رہی ہے۔ صدیاں بیت گئیں پر زخم اور ناسور آخر کب تک چھپے رہتے؟ کبھی نہ کبھی تو اُن کا پردہ فاش ہونا ہی تھا چنانچہ اس پردہ دری کے نتیجہ میں دُنیا میں عجیب اُتھل پُتھل مچی ہوئی ہے۔ —— سارے کے سارے قدیم نظریات اور پُرانی اقتدار ٹوٹ رہی ہیں۔ بالکل اُسی طرح جس طرح ذرّہ ہیچ مقدار (ایٹم) کی دریافت نے تمام دوسرے آلاتِ حرب و ضرب کو بے حقیقت اور غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ لیکن جس طرح ایٹمی آلات کے ساتھ پُرانی چیزوں کا بھی وجود باقی رہے گا اسی طرح ذہنِ ماضی میں لوگ بھی باقی رہیں گے۔ کمی و بیشی کا معاملہ البتہ ناگزیر ہو گیا ہے

آئندہ اوراق میں جن کرداروں کی تصویر کشی کی گئی ہے وہ نہ سکندرِ اعظم ہیں اور نہ شہنشاہ اکبر۔ بقراط ہیں۔ نہ حکیم بزرجمہر۔ بلکہ صرف ہم اور آپ ہیں۔۔ ان میں کچھ وہ ہیں جو راقم اسطور کی طرح ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔ اور دُنیا نے اُن کو فراموش کر دیا۔ اور کچھ ایسے ہیں جن کی خداداد ذہانت و فطانت اور ذاتی محنت و کارکردگی بار آور ہوئی اور وہ قائدِ اعظم، شہیدِ ملت، علامہ سلیمان ندوی۔ اور سر ضیاء الدینؒ بجا طور پر مشہور و معروف ہوئے۔ اس مجلس میں آپ کو سب قسم کے افراد ملیں گے بالکل اسی طرح جس طرح ہماری سماج بھانت بھانت کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر شخص کسی نہ کسی ندرتِ خیال اور رعنائی کردار کا حامل ہے۔۔۔ اور اشخاص و افراد کا یہی تنوع اور رنگا رنگی اس مجموعہ کا حقیقی حُسن ہے۔

تمام صاحبانِ تذکرہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور انکی دائمی جدائی کا تاثر ہی "رسالہ مصنف" علی گڑھ اور "العلم" کراچی میں وقتاً فوقتاً ان پر کچھ لکھنے کا محرک ہوا۔ کسی پر کم لکھا اور کسی پر زیادہ یہ کمی زیادتی اس لئے نہیں کہ وہ کم یا زیادہ لکھنے کے مستحق تھے بلکہ بس یوں ہی فوری جذبات کے تحت جتنا لکھا جا سکا لکھ دیا گیا۔

اس مجموعہ میں آپ کی جن جن سے ملاقات ہوگی اُن میں سے اکثر کے انتقال کی تلخ یادیں آپ کو یقیناً رنجور و ملول کریں گی۔ لیکن المیوں سے

ہم لاکھ بھاگیں اُن سے مفر نہیں۔ علاوہ بریں جملہ اصنافِ ادب میں مسلمہ طور پر المیہ (ٹریجڈی) کو فوقیت بھی حاصل ہے۔ قلم کی شوخی و طراری اُس کی خوں چکانی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نثر ہو یا نظم عظیم ادب آپ کو المیہ ہی یہاں ملے گا کیونکہ وہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ طنز و مزاح زیادہ تر وقتی اور سطحی ہوتا ہے۔ اُس سے اُچٹتا ہوا وقتی سکون حاصل ہو جاتا ہے اور بس!

لیکن کسی تحریر کا مقصد قاری کو محض مسرور یا مغموم کرنا ہی نہ ہو بلکہ ہر نگارش مقصدی اور تعمیری مقاصد کی حامل ہونی چاہئے۔۔۔ اس اعتبار سے ہماری یہ ناچیز کتاب "راہی اور راہ نُما" انشاء اللہ آپ کو مایوس نہ کرے گی۔

ہمیں حقیر گدایانِ عشق را ایں قوم
شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

سید الطاف علی بریلوی
کراچی۔ ۱۲ر مارچ سنہ ۱۹۶۲ء

اے ہم نفسانِ جادۂ محبّت
رفتید، ولے نہ از دلِ ما

قائدِ اعظم

(سنہ ۱۹۴۳ء)

آل انڈیا مسلم لیگ کنونشن کا اجلاس ۲۳ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء کو نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ دلّی میں منعقد ہوا۔ اور بقول قائد اعظم یہ [illegible] لیگ کی سی سالہ حیات میں باعتبار شرکاء اور خوبیٔ انتظام اپنی نوعیت کا بہترین اجلاس تھا۔ اس قسم کے اجتماعات کے لئے دہلی میں سب سے اچھا مقام جامع مسجد کے مقابل ایڈورڈ پارک ہے۔ لیکن اس مرتبہ یہ جگہ حاصل نہ ہو سکی اور مسلمانانِ ہند کا یہ عظیم الشان قومی جلسہ اجمیری گیٹ کے قریب ایک وسیع میدان میں ہوا۔

جناح گراؤنڈ اس میدان میں جلسوں کے لئے شاندار پنڈال بنایا گیا تھا جس میں ایک لاکھ نشستوں کا انتظام تھا۔ پنڈال پر شامیانے لگے ہوئے تھے اور تعجب ہوتا تھا کہ اس قدرِ کثیر تعداد میں شامیانے کس طرح دستیاب ہو گئے۔ پنڈال کے گرد خیموں اور عارضی دوکانوں کو قائم کیا گیا تھا۔ خیموں میں مختلف صوبہ واری مسلم لیگوں، مجلس استقبالیہ اور آل انڈیا مسلم لیگ کے دفاتر تھے۔ ان کے علاوہ چھوٹی

چھوٹی راوٹیوں میں مختلف مقامات کے آئے ہوئے نیشنل گارڈ کیمپ ڈالے
ہوئے تھے۔ خیموں اور پنڈال کے بیچوں بیچ ایک وسیع میدان میں مسلم
لیگ کا بلند و بالا جھنڈا نصب کیا گیا تھا۔ جلسہ گاہ اور پنڈال میں اکابر
ملت کے ناموں سے بہت سے پھاٹک بنائے گئے تھے۔ بجلی کی روشنی کا
اعلیٰ درجہ کا انتظام تھا اور شب کے وقت پوری جلسہ گاہ بقعۂ نور
معلوم ہوتی تھی۔ چھڑکاؤ کے لئے پانی کا وافر انتظام تھا اور صبح و شام پانی
کے چھڑکاؤ سے پورے ماحول میں دلکش تروتازگی کا سماں رہتا تھا۔ دور
دور سے آئی ہوئی کتابوں کی دکانوں کے علاوہ متعدد ہوٹل اور اشیائے
خوردنی و نوشیدنی کی صاف ستھری دکانیں تھیں۔ جن میں نشستوں کا ایسا
معقول انتظام تھا کہ ہر حیثیت کا آدمی وہاں بے تکلف بیٹھ سکتا
تھا۔ جلسہ گاہ کے قریب ہی عربک کالج دہلی میں مہمان ٹھہرائے گئے
تھے۔ یہاں بھی ہر قسم کا انتظام قابل تعریف تھا۔ جس کی تصدیق قائد اعظم
محمد علی جناح نے اپنی آخری تقریر میں یہ کہہ کر فرمائی کہ "یہ پہلا اجلاس ہے
جس میں مہمانوں نے مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہیں کی۔"

پنڈال نصف پنڈال میں کرسیوں کا انتظام تھا اور بقیہ نصف
میں فرش تھا۔ ڈائیس بہت لمبا چوڑا بنایا گیا تھا۔ اور
اس کے دائیں اور بائیں جانب کم از کم پانچ ہزار پردہ نشین خواتین کی
جگہ ڈائیس کے خط مستقیم میں تھی جس سے وہ سامنے کے مجمع کو تو دیکھ
سکتی تھیں۔ لیکن ڈائیس کی کارروائی دیکھنے میں ان کو دقت پیش آرہی

تھی اور اس وجہ سے زنانہ درجوں میں وقتاً فوقتاً کش مکش کے آثار پائے
[illegible] اگر خواتین کی نشست گاہ ہلالی شکل میں واقع ہوتی تو یہ دِقت
[illegible] ڈائیس پر صاحب صدر کی نشست کے پیچھے ارکانِ ورکنگ کمیٹی کی
کرسیوں کی لائن تھی۔ اور ان کے عقب میں وہ حضرات تھے جنھوں نے
کم از کم سو روپیہ کا ٹکٹ خریدا تھا۔ داہنی اور بائیں جانب آل انڈیا مسلم لیگ
[illegible] ارکان کی کرسیاں تھیں جو بہت بڑی تعداد میں ہندوستان کے
[illegible] آئے تھے۔ ڈائیس کے سامنے سب سے پہلے کم از کم سو
[illegible] والوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اور ان کے بعد دس روپے، پانچ روپے،
[illegible] ایک روپیہ اور آٹھ آنے کے درجے تھے۔ اس اجلاس
[illegible] خاص بات یہ تھی کہ چار روز کی کارروائی کے اختتام یعنی ۲۶
[illegible] اپریل کی درمیانی شب میں صبح پانچ بجے تک ٹکٹ یا پاس کا
[illegible] ہوتا رہا اور بلا ٹکٹ والنٹیر صاحبان بیٹھنے کی اجازت
[illegible] تھے۔ پنڈال کے باہر لحاظہ کیمپ میں بھی ٹکٹ دکھا کر داخلہ
ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے جلسہ گاہ میں ہڑبونگ یا فضول قسم کی بھیڑ
[illegible] ہوتی تھی اور لوگوں کو سکون و اطمینان کے ساتھ آپس میں ملنے
جلنے اور تبادلہ خیال کی سہولت مل جاتی تھی۔

الغرض بحیثیت مجموعی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس دہلی
پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ منتظمین نہایت سمجھدار،
سلیقہ شعار اور تجربہ کار تھے۔ جنھوں نے گزشتہ قومی اجتماعات

کے تجربوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر اس مرتبہ حسنِ انتظام کی صحیح معنی
میں تکمیل کر دی۔ ایک اور خاص بات یہ تھی کہ مقررہ پابندیوں پر
عمل درآمد کرتے وقت کسی شخص کے ساتھ سخت کلامی یا بدسلوکی نہ
کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی سیاسی بیداری کا صحیح اندازہ اس کے
قومی اجتماعات سے ہوتا ہے۔ اور مسلم لیگ کے اس اجلاس نے
یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا کہ مسلمانانِ ہند میں حقیقی سیاسی بیداری
پیدا ہو گئی ہے۔

قائد اعظم کا جلوس

۲۳ر اپریل ۱۹۴۳ء کی تاریخ ملّت اسلامیہ کے نشاۃ
ثانیہ کی ایک یادگار تاریخ ہے۔ اس روز
دہلی کے لوگوں نے عرصہ دراز کے بعد وہ سماں اور منظر دیکھا جس کے
لئے تحریکِ خلافت کے بعد آنکھیں ترس گئی تھیں۔ بعد نماز جمعہ
قائد اعظم محمد علی جناح کا جلوس عدیم النظیر شان و شوکت کے ساتھ
آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر دفتر دریا گنج سے اُٹھا اور جامع مسجد۔
چاندنی چوک۔ فتح پوری۔ حوض قاضی اور اجمیری گیٹ ہوتا ہوا جلسہ گاہ
پہنچا۔ اس پورے راستہ کو خوشنما پھاٹکوں سے سجایا گیا تھا۔ اور سڑکوں
کے ہر دو جانب بالاخانوں سے قائد اعظم کی سواری پر پھولوں
کی بارش ہو رہی تھی۔ زمین پر دکانوں پر اور دو منزلی سہ منزلی
اور چو منزلی عمارات کے چپہ چپہ پر مشتاق دید انسانوں کا سمندر
ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ عین بعد نماز جمعہ ہندوستان کے مختلف مقامات

سے آتے ہوئے نیشنل گارڈ اپنی رنگ برنگ کی وردی پہنے باقاعدہ
مارچ کرتے ہوئے مسلم لیگ کے جھنڈوں اور بینڈ کے ساتھ آنا شروع
ہوئے اور جب قریب چار بجے سہ پہر تک ان کا اجتماع دریا گنج میں
مکمل ہو گیا تو جلوس روانہ ہوا، جس کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے تین ہاتھی
اور اس کے بعد اونٹ اس کے بعد گھوڑے، پھر سائیکلیں اور ان کے
بعد نیشنل گارڈ اور طالب علموں کے دستے تھے۔ سب سے آخر میں
قائد اعظم کی سواری تھی۔ موصوف کو ایک لاری پر کرسی ڈال کر بٹھایا
گیا تھا۔ پورا جلوس کم از کم دو میل لانبا تھا۔ عجب قابلِ دید سماں
تھا۔ فضائے آسمانی مسلم لیگ زندہ باد!۔ قائد اعظم زندہ باد!۔
اور نعرہ ہائے تکبیر سے گونج رہی تھی۔ خوشنما پھاٹکوں۔ جھنڈوں۔
کاغذی پھولوں کی بارش۔ بینڈ اور قومی ترانوں کی گھما گھمی تھی۔
ہاتھیوں کے پیچھے اونٹوں کی قطار البتہ آنکھوں کو کھٹکی۔ عرب کو عجم
سے پیچھے رکھنا چاہئے تھا! اسی طرح جلوس کے پیچھے پولیس کی
لاریاں اگرچہ انتظاماً تھیں لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی بے بسی
کی غمازی کر رہی تھیں۔ جب قائد اعظم کی سواری بادِ بہاری کی
طرح مسجد شاہ جہانی کے قریب آئی تو اس وقت عجب پر کیف
منظر تھا۔ ایک طرف مسجد شاہی اور دوسری جانب لال قلعہ کی بلند
و بالا [illegible] عمارات مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی یاد تازہ کر رہی تھیں
اور مقابل حضرت سرمد علیہ الرحمۃ اور ہرے بھرے شاہ

رحمتہ اللہ علیہ کے مزارات کی کشش روحانی دلوں میں ارتعاش
پیدا کر رہی تھی۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر خلق اللہ کا ایسا ہجوم
تھا کہ باید و شاید۔

ضیغم اسلام کی سلامی

قائدِ اعظم اس مقام پر پہنچے تو تالیوں
کی گونج اور اللہ اکبر کے نعروں میں
جوش و خروش پہلے سے دہ چند ہو گیا۔ عین اس وقت قایدِ اعظم نے
اپنی نشست سے کھڑے ہو کر جانب شرق نہایت عزت و احترام
سے سلام کیا اور اس سے لوگوں کو یاد آیا کہ اس تاریخی مقام پر
ایک اور بزرگ ہستی فروکش ہے یعنی ضیغم اسلام مولانا شوکت علی مرحوم کیا
مولانا شوکت علی مرحوم کی عظیم الشان شخصیت ان کے جوش اسلامی اور
قربانیوں کو فراموش کر دیا جاتا؟

فرزندانِ توحید کو گرماتا ہوا اور اغیار کے قلب و جگر کو برماتا ہوا
جلوس آگے بڑھا۔ پورے چاندنی چوک میں لاکھوں انسانوں کا ہجوم تھا۔
اور قطار و قطار مشتاقانِ جمالِ قائداعظم شوقِ دید میں ایک دوسرے پر گرے پڑتے
تھے۔ دہلی اور دہلی والوں نے بڑے بڑے جلوس دیکھے ہیں لیکن لوگ کہتے
تھے کہ گزشتہ بیس۲۰ سال کے عرصہ میں یہ سب سے بڑا جلوس تھا۔

مس فاطمہ جناح

مسجد فتح پوری کے صدر دروازہ سے بالکل متصل
ایک عمارت کی بالائی منزل پر قائداعظم کی ہمشیرہ
محترمہ مس فاطمہ جناح، قائدِ ملت نواب زادہ لیاقت خاں اور دوسرے

معزز حضرات کے ساتھ تشریف فرما تھیں۔ ایک بہن اپنے بھائی کا جلوسِ شاہانہ
دیکھنے آئی تھی۔ جوں جوں بھائی قریب آتا جاتا تھا فرطِ انبساط اور جوشِ مسرت
میں اضافہ ہو رہا تھا تا آنکہ جب تھوڑا فاصلہ رہ گیا تو جوشِ محبت نے بے قابو
کر دیا۔ عجب دلکش اور پُراثر منظر تھا۔ جو لوگ ان بہن بھائی کی ایک دوسرے
سے والہانہ محبت سے واقف ہیں وہی متذکرۂ بالا کیفیت سے حقیقی معنیٰ میں
لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ہمہ وقت
کے ساتھی اور غمگسار ہیں اور کوئی نہیں جان سکتا کہ قائداعظم کی شخصیت بنانے
اور ان کی قوتِ عمل کو قائم رکھنے میں اس عزیز بہن کا کس قدر ہاتھ ہے۔
انہوں نے اپنی زندگی کی تمام مسرتوں اور راحتوں کو بھائی کے آرام پر قربان
کر دیا اور اس ضعیفی میں ان دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے جس قدر
[illegible] ہے احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ محبت کی جب یہ منزل آتی ہے کہ

"من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی"

تو مرحلۂ حیات میں انسانیت کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اسی تکمیل انسانیت
کا مظہر قائداعظم محمد علی جناح ہیں جن کے فیوض کردار سے ملت اسلامیہ آج
زندگی کی بلند منزل پر تیزی کے ساتھ چڑھ رہی ہے۔

پرچم کشائی

قبل مغرب جلوس کیمپ میں پہنچ گیا۔ اور وہاں ہلالی
جھنڈے کی پرچم کشائی کی رسم ادا ہوئی۔ اس وقت
قریب دس ہزار آدمی قائداعظم کے حکم سے زمین پر بیٹھ گئے۔ اور اپنے رہنما کی
مناسب موقع تقریر کو سنا۔ پرچم اسلام جب زمین سے بہت بلند ہوا اس قدر

بلند جتنی کہ آج کل مسلمانوں کی ہمت بلند ہے فضا میں لہرایا گیا تو دل سے یہ آواز نکلی ؎

ہمت بلند دار کہ نزد خدا و خلق　　باشد بہ قدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو

مسلمانوں کا جوش اسلامی ظاہر کر رہا تھا کہ یہ جھنڈا زمین پر نہیں بلکہ ان کے دلوں پر نصب ہو چکا ہے اور وہ اسے اب کسی قیمت پر سرنگوں نہ ہونے دیں گے۔

پہلا اجلاس عام

دوسرے روز ۲۴ / اپریل ۱۹۴۳ء کو صبح دس بجے پہلا اجلاس عام شروع ہوا۔ کارروائی جلسہ کا آغاز ہونے سے پہلے قریب تمام نشستیں پر ہو چکی تھیں۔ ڈائس کے اوپر اور ڈائس کے نیچے پنڈال میں وائسرائے کی ایگزکٹو کونسل کے ارکان سے لے کر دفتر کے کلرکوں اور فیکٹریوں کے مزدوروں تک کا نمائندہ اجتماع تھا۔ اسی طرح پریس گیلری میں امریکن اور چینی اخبار نویسوں سے لے کر معمولی ہفتہ وار اخباروں تک کے نمائندے موجود تھے۔ قریب گیارہ بجے قائد اعظم تشریف لائے پر جوش خیر مقدم ہوا۔ ایسا پر جوش کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ تھوڑی دیر میں مسٹر حسین ملک صدر استقبالیہ نے اپنا خطبہ پڑھا۔ افسوس ہے اردو الفاظ کے "تلفظ" کی بکثرت غلطیوں کی وجہ سے مجمع نے اسے دلچسپی کے ساتھ نہ سُنا۔ لیکن ملک صاحب کے حُسن انتظام جلسہ کا چوں کہ ہر شخص کو اعتراف تھا اس لئے ان کی تقریر صبر کے ساتھ سُنی گئی۔

خطبۂ صدارت

خطبۂ استقبالیہ کے بعد قائد اعظم کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے اور اپنا وہ تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس کی اس وقت دنیائے سیاست میں دھوم ہے۔ مسلمانوں کے اس بوڑھے اور ضعیف قائد نے مسلسل تین گھنٹے اپنی پُر اثر تقریر کو جاری رکھا۔ شروع سے لے کر آخر تک آواز اور خیالاتِ زرّیں کی آمد میں ذرّہ برابر کمزوری نہ پیدا ہوئی۔ فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے۔ اور تدبر و دانائی کا دلوں پر ہمیشہ قائم رہنے والا نقش مرتسم کر دیا۔

اپنے مخصوص انداز میں مولوی فضل الحق سابق وزیر اعظم بنگال کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد اپنی موجودہ سیاسی پالیسی پر ایک تاریخی بیان دیا۔ دادا بھائی نوروجی اور مسٹر گوکھلے آنجہانی سے سند استفادہ کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹۱۷ء تک انڈین نیشنل کانگریس سے اپنی وابستگی اور خدمات پر تفصیل روشنی ڈالی۔ مسٹر گاندھی کے اثر و نفوذ کے باعث کانگریس سے علیحدگی کے اسباب و علل سے بحث کی اور بتایا کہ جب مذہب کو سیاسی نصب العین بنا لیا گیا اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ مسٹر گاندھی ہندوستان میں رام راج قائم کر کے مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے زیرِ نگیں رکھنا چاہتے ہیں تو مجھ کو مجبوراً اپنی راہ عمل بدل دینی پڑی۔ نہ صرف مجھ کو بلکہ چند سال بعد مولانا محمد علی مرحوم بھی علیحدہ ہو گئے۔ میری بابت کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ میں جیل جانا نہیں چاہتا تھا اس لئے کانگریس سے علیحدہ ہو گیا۔ لیکن مولانا محمد علی نے تو کافی جیل کاٹی اور کسی سے کچھ کم قربانیاں نہیں دیں۔ لیکن

وہ بھی آخر میں بددل ہو گئے۔ اور اُنھوں نے کانگریس اور ہندو قوم کی ذہنیت کے خلاف ایسے ہی خیالات کا اظہار شروع کر دیا جیسے خیالات کا اظہار آج میری جانب سے ہو رہا ہے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۶ء تک کے ہندو مسلم فسادات۔ نہرو رپورٹ۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس اور ۱۹۳۵ء کی اصلاحات نیز مابعد کی کانگریسی حکومتوں کی بے راہ روی پر سیر حاصل روشنی ڈالی اور موقع بموقع اہم اقتباسات پڑھ کر سُنائے۔ کانگریس کی غلطیوں پر تبصرہ کرنے کے بعد قائد اعظم نے برٹش گورنمنٹ کی آزادیٔ ہند کے سلسلہ میں لاپروائی اور بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ بے اعتنائی پر بحث کی۔ اور متنبہ کیا کہ ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اگر جلد از جلد تلافیٔ مافات نہ کی گئی تو مسلم لیگ ایک مناسب قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے گی جو گورنمنٹ کے لئے باعث تکلیف ہو گا۔

آخر میں قائد اعظم نے مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مؤثر انداز میں بیان کیا اور ان صوبوں کی وزارتوں نیز سرمایہ دار طبقہ کو آگاہ کیا کہ اگر وہ ملت کے نئے رجحان اور نصب العین سے اپنی روش کو ہم آہنگ نہ کریں گے۔ تو ان کو نقصان پہنچ جائے گا۔ قائد اعظم نے بتایا کہ اپنے موجودہ حالات اور ضعیفی کے زمانہ میں جب کہ مجھ کو آرام کرنے کی ضرورت تھی میں یہ ساری تکلیف طبقۂ امرا کی فلاح و بہبود کے لئے نہیں اُٹھا رہا ہوں۔ پاکستان ایک صحیح قسم کی جمہوریت ہو گی، اور اس کی حکومت عوام اور غریبوں کی حکومت ہو گی۔

خطبہ کی خصوصیات۔ قائد اعظم کا یہ معرکۃ الآرا خطبۂ صدارت جو

موصوف نے زبانی بزبان انگریزی، ارشاد فرمایا۔ اس کا ضروری خلاصہ ۲۵ اپریل ۱۹۴۳ء کے انگریزی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ مفصل تین گھنٹے کی تقریر بھی ۳ مئی کے اخبار "ڈان" میں شائع ہو چکی ہے۔ اس تقریر میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ پانچ چیزیں خصوصیت کے ساتھ نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ قائد اعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ پر فرقہ پرستی اور آزادیٔ وطن کی مخالفت کا الزام تھا۔ اس الزام کی تقریر کے اس حصہ سے پوری پوری تردید ہو گئی جو تاریخی پس منظر پر مشتمل ہے۔

۲۔ مسلم لیگ کی آواز حکومت برطانیہ کے خلاف کمزور نظر آتی تھی اس مرتبہ اس میں بہت طاقت اور شدت نظر آ رہی ہے۔

۳۔ ہندو اکثریت کی جانب صاف اور صریح الفاظ میں اور غیر مبہم طریقہ پر مصالحت کا ہاتھ بڑھایا گیا ہے۔

۴۔ مسلم لیگ صرف خطاب یافتوں اور سرمایہ داروں کی جماعت نہیں ہے بلکہ وہ متوسط الحال تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غریبوں کی اس وقت سب سے بڑی نمائندہ مسلم جماعت ہے۔

۵۔ قائد اعظم محمد علی جناح اس لئے کہ ان سے زیادہ معمر تجربہ کار اور قابل کوئی دوسرا رہنما مسلمانوں میں موجود نہیں ہے۔ ایک قانون داں۔ مدبر اور معتدل پالیسی والے لیڈر کی حیثیت سے بہت کافی آگے بڑھ کر ایک دردمند محب وطن کی حیثیت سے اس وقت دنیائے سیاست پر

منتو فگن ہیں۔ ان کی اس آخر الذکر حیثیت میں اب مکمل پختگی اور ایثار کا جذبہ نمایاں ہے۔ اور یہ مسلمانوں کی اس گئے گزرے زمانہ میں جبکہ مخلص، بہادر اور قابل رہنماؤں کا قحط الرجال ہے سب سے بڑی خوش نصیبی ہے۔

دوسرا اجلاس

مسلم لیگ کے اجلاسوں میں یہ بات بہت پسندیدہ تھی کہ ایک جلسہ کے بعد دوسرے جلسہ میں وقفہ کافی ملتا تھا اور اس فرصت میں لوگوں کو آرام کرنے۔ مسائل ملی پر غور و فکر کرنے، دلی کی سیر کرنے اور دوسرے چھوٹے چھوٹے جلسے کرنے کا کافی وقت مل جاتا تھا۔ چنانچہ پہلے اجلاس عام کے بعد دوسرا جلسہ ۲۵ اپریل کو رات کے دس بجے منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں بھی کافی رونق اور مجمع تھا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد چند نظمیں ہوئیں۔ انور قریشی صاحب کی نظمیں مسلم لیگ کے اجلاسوں میں خصوصیت کے ساتھ مقبول ہوتی ہیں۔ اس موقع پر قائد اعظم کی شان میں جو نظم پڑھی اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اثر ہے یہ آتش بیانی کا اس کی　　کہ منہ کانگریس کا دھواں ہو رہا ہے
یہ پیری میں چہرہ کی رونق تو دیکھو　　میرا پیر پھر نوجواں ہو رہا ہے
سلامت رہے قائداعظم الٰہی　　وظیفہ یہ وردِ زباں ہو رہا ہے

چندہ

نظموں کے بعد مسلم لیگ کے لئے چندہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے کاٹھیاواڑ کے ایک نہایت نوعمر نوجوان

سی داؤد یعقوب نے سو۔ سو روپئے کے (۱۵) نوٹوں کا ہار قائداعظم کو پہنایا۔ اسی نوجوان نے سو۔ سو روپئے کے پانچ نوٹوں کا ایک اور ہار تھوڑی دیر میں نذر کیا۔ اس کے بعد مسٹر ایم۔ اے منصور احمد شاہ کا تیار کردہ قائداعظم کا فوٹو پیش ہو کر نیلام ہوا۔ چند بولی بولنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

نام	رقم	
مسٹر محمد علی منشیار بمبئی	پانچ سو	روپئے
لیڈی سر عبداللہ ہارون صاحبہ کراچی	چھ 〃	〃
نواب صاحب آف ممدوٹ لاہور	ایک ہزار	〃
امجد علی شاہ صاحب	گیارہ سو	〃
سید جواد علی شاہ صاحب گورکھپور	پندرہ 〃	〃
یعقوب اینڈ سنز	سولہ 〃	〃
حاجی ممتاز الدین صاحب دہلی	دو ہزار	〃
آخری بولی نواب صاحب ممدوٹ	بائیس سو	〃

اس تصویر کے فروخت ہونے کے بعد پاکستان کا ایک نقشہ فروخت ہوا جس کو بہت سی بولیوں کے بعد میاں محمد ممتاز خاں صاحب دولتانہ پنجاب نے چھتیس سو روپے میں خریدا۔ چندے کا یہ سلسلہ اجلاس کے آخر تک جاری رہا اور ستر ہزار روپئے سے زیادہ اس نشست میں جمع ہوئے۔

رپورٹ سکریٹری

اس کے بعد قائد ملت نواب زادہ

لیاقت علی خاں صاحب جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی سالانہ رپورٹ پڑھی جو کرپس مشن کی ناکامی۔ مسٹر راج گوپال اچاری کی تائید پاکستان۔ ۱۰ اگست ۱۹۴۲ء سے کانگریس کی تحریک سول نافرمانی۔ مسلمانوں کی اس سے بوجوہ بے تعلقی۔ دورانِ سال میں کانگریس اور گورنمنٹ کی جانب سے تجویز پاکستان کی مخالفت۔ نواب محمد اسماعیل خاں صاحب کی قیادت میں مسلم ڈیفنس کمیٹی کا ملک کے طول و عرض میں قریب پندرہ ہزار میل کا دورہ۔ پنجاب اور بنگال کے ضمنی انتخابات میں امیدواران مسلم لیگ کی کامیابی اور انگریزی اخبار "ڈان" کے روزنامہ کئے جانے پر مشتمل تھی۔

تجویز تعزیت رپورٹ کی منظوری کے بعد حاجی سر عبد اللہ ہارون صاحب اور سر سکندر حیات خاں کی وفات پر تعزیت کا رزولیوشن پاس ہوا۔ نہ معلوم کس وجہ سے تجویز تعزیت میں مسلم لیگ کے سابق صدر اور دیرینہ کارکن مولوی سر محمد یعقوب کا نام شامل ہونے سے رہ گیا۔ (غالباً سہواً ایسا ہوا)۔

دیگر تجاویز دوسرا رزولیوشن جنوبی افریقہ کے "کالے بل" کے متعلق مسٹر ظہیر الحسن لاری ایڈووکیٹ۔ ایم۔ ایل۔ اے گورکھپور نے پیش کیا۔ مسٹر لاری مسلم یونیورسٹی یونین

اور یو۔ پی اسمبلی کے مشہور اور ہونہار مقرر ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ محترم صدر مجلس استقبالیہ کی تقریر کی طرح ان کی تقریر میں بھی اُردو کے بہت سے الفاظ غلط استعمال کئے گئے۔ ایسی صورت میں جب کہ ہم آل انڈیا ریڈیو اور دوسرے لوگوں پر غلط اُردو کے استعمال پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم معززین اور وہ بھی یو۔ پی کے لوگوں سے صحیح اُردو بولنے اور لکھنے کا مطالبہ نہ کریں۔ اس حرف گیری سے ہمیں اپنے عزیز دوست مسٹر لاری کی قابلیت کا کسی نوع سے استخفاف منظور نہیں ہے۔

رزولیوشن کی تائید سر سیّد رضا علی صاحب نے کی۔ سیّد صاحب کی اُردو زبان میں تقریر سننے کا پہلا اتفاق تھا اور ہمیں اعتراف ہے کہ موصوف اُردو کے نہایت خوش بیان اور صاحب ذوق مقرر ہیں۔ انداز بیان دل آویز اور طرز استدلال معنیٰ خیز ہوتا ہے۔ کیا مجال کہ ایک لفظ غلط بولیں۔ دوران تقریر میں برمحل اور پھڑکتے ہوئے اُردو اور فارسی کے اشعار کا استعمال سونے پر سہاگہ کا کام دیتا تھا۔ تقریر کے لئے قلت وقت کا شکوہ ملاحظہ ہو ؎

میں دردِ غم کا قصہ پورا نہ کر سکوں گا
اندازہ آپ کر لیں سن کر کہیں کہیں سے

تیسرا ریزولیوشن لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد صاحب کی تحریک اور آنریبل سید حسین امام صاحب کی تائید سے ضروریات زندگی کی چیزوں کی کمیابی اور گرانی کے متعلق پاس ہوا۔ دونوں تقریریں بہت عمدہ ہوئیں۔

چوتھا رزولیوشن سید ذاکر علی صاحب نے کانگریسی سول نافرمانی کے سلسلہ میں تعزیری ٹیکس کے متعلق پیش کیا۔ جس سے مسلمانوں کو اکثر مقامات پر مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ اس رزولیوشن کی تائید باری باری سے ہندوستان کے تمام صوبوں کے نمائندوں نے کی اور اس لئے اس پر کافی وقت صرف ہوا۔ دو ایک اور رزولیوشنوں کے بعد قریب ڈھائی بجے شب جلسہ ختم ہوا۔

مسٹر یوسف عبداللہ ہارون

اس جلسے میں مسٹر یوسف عبداللہ ہارون سالار اعظم مسلم نیشنل گارڈ کی شخصیت بہت زیادہ جاذب توجہ رہی کیونکہ انھوں نے مسلم لیگ کے لئے حصولِ چندہ میں نمایاں کوششِ و حسنِ تدبیر سے کام لیا۔

تیسرا اور آخری اجلاس

۲۶ اپریل کی شب کو منعقد ہوا اور کارروائی کا آغاز حسب معمول اعلانات چندہ سے ہوا۔ مسلم لیگ کیمپ کے مسلمان مزدوروں کی جانب سے تین سو روپے کا اعلانِ چندہ خصوصیت

کے ساتھ بہت قیمتی تھا۔ اس اجلاس میں دو نہایت معرکے کے رزولیوشن پاس ہوئے۔ ایک سندھ کے "پیر پگاڑو" کے متعلق اور دوسرا اجلاسِ لیگ کا خاص رزولیوشن مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان اور ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کے بارے میں تھا۔ پہلے رزولیوشن کی تحریک و تائید مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی اور قائد ملت نواب زیادہ لیاقت علی خاں صاحب نے فرمائی اور تائید مزید پنجاب کے سید مصطفےٰ شاہ صاحب گیلانی نے کی۔

آخر الذکر تقریر بہت جوشیلی تھی اور رزولیوشن سندھ کی نازک صورت حالات کے عین مطابق تھا۔

مسلم لیگ کے آخری اجلاس میں پاکستان کے رزولیوشن کو چودھری خلیق الزماں صاحب نے پیش کیا اور اس کی تائید آنریبل الحاج محمد ہاشم گزدر صاحب سندھ۔ ملک سر خضر حیات وزیر اعظم پنجاب و آنریبل عبدالمتین چودھری وزیر آسام۔ سردار اورنگ زیب خاں صوبہ سرحد۔ مولانا محمد اکرم خاں بنگال اور دوسرے حضرات نے کی۔

ایک اور اہم رزولیوشن کے ذریعہ قیادت ملی کے کل اختیارات قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کو تفویض کئے گئے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب بھی دوبارہ جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس آخری جلسہ کی کارروائی ۲۷ اپریل کو صبح

۴ بجے باضابطہ ختم ہوئی۔ اس کے بعد نواب بہادر یار جنگ بہادر کی تقریر ہوئی۔ نواب صاحب نے اپنی سحر بیانی سے چندے کی رقم کو سوا لاکھ تک پہنچا دیا۔ قریب ۵ بجے صبح اجلاس ختم ہوا۔ حضرت قائد اعظم آخر تک کرسی صدارت پر رونق افروز رہے جو اُن کی فرض شناسی اور عزم و استقلال کی بہترین مثال تھی۔

قائد اعظم زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!!
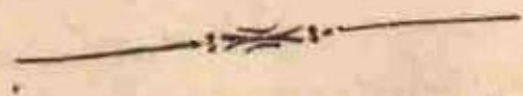
ڈاکٹر ذکی الدین

۱۹۴۴ء

دردِ دل لکھوں کیونکر، جاؤں اُن کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

یہ سہ ماہی اچھی نہیں گذری۔ ایک حادثہ جانکاہ نے اس قدر دل تنگ کیا کہ زندگی زندانِ غم بن گئی۔ لیکن ایک کاروباری انسان کا تارِ نفس چاہے کس قدر ہی شکارِ اثر کیوں نہ ہو۔ اُس کو چاہئے کہ صرف کام کئے جائے۔ دنیا اس سے کام اور اُس کے کامیاب نتائج مانگتی ہے اور بس! مصائب و آلام سے ہمدردی کی جائے گی لیکن ایک دن کے ہرج کا بھی ہرجانہ ضرور دینا ہوگا۔

یہ حادثہ ذاتی سے زیادہ قومی و علمی ہے اس لئے ناظرین مصنف کو شریکِ غم کرنا ضروری ہے۔ دار العلوم علی گڑھ کے ہمارے ایک نہایت عزیز ساتھی ڈاکٹر محمد ذکی الدین ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ ذکی مرحوم اپنی خوش اخلاقی، خوش وضعی، دوست نوازی اور قابلیت علمی کی وجہ سے ہر دلعزیز اور ہر ایک کی آنکھ کا تارا تھے۔ افسوس صرف ۳۵ سال کی عمر

پائی شغف علمی کی وجہ سے ابھی تک شادی بھی نہیں کی تھی ۱۹۰۹ء میں بمقام آرہ (صوبۂ بہار) پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی مولوی محمد فصیح الدین صاحب ہے جو آرہ شہر کے رئیس اور صوبۂ بہار کے ایک ممتاز مسلمان خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ذکی کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور آرہ ضلع اسکول میں ہوئی، کچھ عرصہ پٹنہ کالج میں پڑھا اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوئے سنہ ۱۹۳۰ء میں بی، اس، سی (آنرز) میں اول آئے وظیفہ تعلیمی اور طلائی تمغہ پایا، اسی طرح سنہ ۱۹۳۲ء میں ایم، ایس، سی (آنرز) میں پوری یونیورسٹی میں اول رہے طلائی تمغہ پایا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۳۱ء سے سنہ ۱۹۳۳ء تک طبعیات میں ریسرچ اسکالر رہے اور اس مضمون میں مسلم یونیورسٹی کے پہلے ڈاکٹر ہوئے۔ ایک ہونہار ماہر طبعیات ہونے اور تعلیمی کارناموں کی وجہ سے "الگزینڈر فان ہمبولڈٹ فاؤنڈیشن برلن" نے آپ کو اپنے یہاں کا وظیفہ دیا اور سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء تک موصوف نظری اور عملی طبعیات پر ہان یونیورسٹی جرمنی میں کام کرتے رہے، ایک سال کی قلیل مدت میں ہان یونیورسٹی سے اوّل درجہ کی ڈاکٹریٹ حاصل کی اس کے بعد ڈاکٹر ذکی انگلستان گئے وہاں لارڈ رودرفورڈ نے لیکوڈ ہیلیم پر تفحص کے لئے "رائل سوسائٹی مانڈ لیبارٹیری" کے تحقیقی کام کی رقم منظور کی، اس زمانے میں ڈاکٹر ذکی نے بڑی عجیب و غریب چیزیں دریافت کیں جن کا ذکر اس مضمون کی معیاری کتابوں میں اکثر و بیشتر آتا ہے اور ان کی تحقیقات کے نتیجے میں بعض جدید شاہراہیں کھل گئیں جن پر انگلستان، جرمنی، روس اور امریکہ میں کام ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر ذکی نے اپنے

فن پر متعدد بلند پایہ تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ مرحوم کا یہ بھی ارادہ تھا کہ وہ اپنی تمام تر تحقیقات علمی کو اُردو زبان میں منتقل کر دیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ شروع بھی کر دیا تھا اور ان کی حسب ذیل تین کتابیں اُردو زبان میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہیں:-

(۱) سائنس کیا ہے۔ (۲) لارڈ رودرفورڈ۔ (۳) یورپ کے چند علماء سائنس (حصہ اول و دوم)۔

جرمنی اور انگلستان سے فارغ التحصیل ہو کر ڈاکٹر ذکی الدین نے مسلم یونیورسٹی ہی میں ملازمت کی طلباء اور اپنے ہمعصر اساتذہ میں خاص وقعت و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور ان کی ذات سے ہمارے دار العلوم کی آئندہ بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ مرحوم کی اچانک وفات دنیائے علم و تحقیق اور دار العلوم علی گڑھ کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کا انتقال ان کے اعزا و احباب کے لئے جس قدر روح فرسا ہے اس کا تو ذکر ہی کیا۔ بہر حال مرضی مولا از ہمہ اولیٰ۔ ہم خلوص دل سے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر ذکی مرحوم کے غم زدہ والدین اور ان کے عمر بھر کے ساتھی اور دوست ڈاکٹر محمد محمود احمد ایم، اے، پی۔ ایچ ڈی کی خدمت میں اظہار تعزیت کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اللہ تعالٰے اُن کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر ستارؔ خیری

(سنہ ۱۹۴۵ء)

۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۴۵ء کو ہماری مجلس مصنفین علی گڑھ کے ایک معزز رکن پروفیسر عبد الستار خیری کا اچانک قلب کی حرکت بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ خیری صاحب ایک سچے، پکے اور پُر جوش مسلمان تھے۔ ساری عمر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت گذاری کی اپنی اسی دُھن میں بے انتہا مصائب بھی جھیلے سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اُن دنوں آپ جرمنی میں تھے۔ جہاں نظر بند ہو گئے۔ بیس سال بعد وطن اور عزیزوں کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی۔ اپنے اسی قیام جرمنی کے سلسلے میں خیری صاحب نے دوسرے ممالکِ یورپ وایشا کی سیاحت بھی کی اس زمانہ میں خیری صاحب علامہ راشد الخیری مرحوم کے رسالہ ''عصمت،، دہلی میں اقوامِ یورپ کی تعلیمی صنعتی اور معاشرتی ترقیوں کے بارے میں مضامین لکھا کرتے تھے جو بالعموم بہت دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ غالباً سنہ ۳۲ء یا سنہ ۱۹۳۳ء میں ہندوستان واپس آئے تو مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور یہاں کی اسلامی تحریکوں سے وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد فرینچ

اور جرمن زبانوں کے پروفیسر مقرر ہوئے اور آخر دم تک اپنے فرائض نہایت خلوص وانہماک سے انجام دیتے رہے سنہ ۳۹ء کی دوسری جنگ شروع ہونے پر خیری صاحب تین سال سے زائد جھانسی اور نینی تال میں دوبارہ نظر بند رہے۔ گذشتہ سال رہا ہوئے تو مسلم لیگ کے کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ آپ مسلم یونیورسٹی مسلم لیگ کے بانی اور صدر تھے "مجلس مصنفین" کے جلسوں میں بھی پابندی سے شریک ہوتے تھے اور ۲۰ جنوری سنہ ۴۵ء کی باونویں مجلس میں آپ کا "اسلامی مخیلہ" کے عنوان پر مقالہ ہوا تھا۔ غرض ؎

"تڑپ صحن چمن میں آشیاں میں شاخساروں میں
جُدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

پروفیسر خیری کا پورا پورا عمل تھا۔ مرحوم بڑے خلیق، ملنسار، دوست نواز اور محبت کرنے والے انسان اور مسلمان تھے۔

۱۳ ستمبر کو بعد نماز جمعہ خیری صاحب کے ہزاروں مدّاحوں نے اُن کی نماز جنازہ پڑھی۔ اس وقت غالبؔ کا حسب ذیل شعر ہمارے وردِ زبان تھا ؎

مرہم کی جستجو میں پھرا ہے" یہ دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

میرا بیٹا "شاہد"

(سنہ ۱۹۴۶ء)

دیدہ خوں بار ہے مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

مخدومی مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری مرحوم کا مقالۂ تعزیت سپرد قلم کرنے کے بعد دعا کی تھی کہ خدایا! ایسا کرم فرما کہ دوبارہ ایسی درد انگیز تحریر سے صفحات "مصنف" کو سوگوار بنانے کی نوبت نہ آئے۔ لیکن کیا معلوم تھا کہ۔ ع

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے

۳۰ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء کو مولانا نے داغِ مفارقت دیا۔ اپریل اور اس کے بعد مئی کے چند دن محض سوگواری میں یا بالفاظ دیگر بخیریت گذرے تھے کہ۔ ع

صد بیاباں بگذشت و دگرے پیدا شد

میری بھتیجی جسے اپنے بچوں کی طرح پال پوس کر بڑا کیا۔ علیل ہوگئی۔ ہنوز سخت بیمار ہے اور پہاڑ پر زیر علاج ہے۔ میرے اور میری رفیقۂ حیات سیدہ انیس فاطمہ کے اوقات عزیزہ کی جانب سے شدید تشویش کے عالم میں گزر رہے تھے کہ ہم لوگوں کو اچانک ایک اور ایسا غم ہوا کہ اس وقت سے ؎

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ آہِ شرربار دیکھ کر

۲۹ جون سنہ ۱۹۴۶ء کی سہ پہر کو ہمارے بڑے لڑکے سید شاہد علی کے متعلق نینی تال سے تار ملا کہ اس کی حالت ناامیدی کی ہے۔ اس قسم کے "ناامیدی" کے تاروں کا مجھے تجربہ ہے۔ چنانچہ اس کے موصول ہوتے ہی دل میں جو کھٹکا گمان گذرا، وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ تفصیل جگر خراش ہے۔ نہ میں سنا سکتا ہوں نہ آپ سن سکتے ہیں ؎

اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گذری
دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے

"شاہد" ہمارا جگر گوشہ تھا۔ ہم اُس کی کیا تعریف کریں۔ مخدومی مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی ایڈیٹر "کانفرنس گزٹ" کی زبانی چند کلمے سنئے۔

سید شاہد علی نے ۲۸ جون سنہ ۱۹۴۶ء کو (چند گھنٹے) ہیضہ میں مبتلا ہو کر بمقام نینی تال انتقال کیا۔ عمر صرف سولہ سال تھی۔ اسی سال

ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ مرحوم نہایت شریف طبع، سلیم الفطرت، مہذب اور فرماں بردار بچہ تھا۔ اس لئے ہر شخص اس کو عزیز رکھتا تھا، پڑھنے اور کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا اور باوجود جسمانی کمزوری اور ناتوانی اپنے ہمعصر بچوں سے زیادہ محنت کرتا تھا۔ اپنے تعلیمی مستقبل کے متعلق مرحوم کے دل میں بڑے بڑے حوصلے تھے لیکن۔

ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

"تلاوت کلام پاک نہایت دل گداز لہجہ میں کرتا تھا اور اذان ایسی دل آویز اور پُر اثر دیتا تھا کہ بس سنتے ہی رہیئے۔ اپنی خود غرضی سے میں شاہد کو سمجھایا کرتا تھا کہ یہ قومی اور تصنیفی کام بہت منحوس ہوتے ہیں اِن میں مبتلا رہنے والے ہمیشہ برباد اور پریشان حال رہتے ہیں۔ مگر اُس نے میرا کہنا نہ مانا اور مجھ سے چُھپ چُھپ کر اپنے ہم عمروں کی قومی انجمنیں اور کلب بناتا۔ تقریریں کرتا اور جوشیلے مضامین لکھتا تھا۔ کہتا۔

"میں مجاہد ہوں اسلام اور مسلمانوں کے لئے اپنی جان
قربان کر دوں گا۔"

کاش اُسے یہ موقع نصیب ہوتا؟ لیکن نہیں؟ کیا معلوم؟ اس کے کئے ہوئے قومی کام سے ملک و ملّت کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا اور خدائے قادرِ مطلق نے ایک جان لے کر ہزاروں خطروں سے حفاظت کر دی ہو، مگر پھر خیال ہوتا ہے کہ قدرت نے اس کو پیدا ہی کیوں کیا تھا؟

ع۔ یہ معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

۳۰ر جون ۱۹۶۶ء سے اب تک عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں نے بالمشافہ اور بذریعہ ڈاک میری اور میری رفیقۂ حیات کی غمخواری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ دل نہادی کا ایک سب سے موثر طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ قریب قریب ہر شخص نے ذاتی اور دوسروں کی صدہا نوجوان موتوں کے دل خراش قصے سنائے تاکہ ہمیں اپنا حادثہ غیر اہم نظر آنے لگے۔ مگر اِس سے تسکین کے بجائے بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ ہمارا دلِ دردمند دوسروں کی تکلیف سے بھی اتنا ہی بے چین ہوتا رہا ہے جتنا کہ اپنے لڑکے کے لئے ہے۔ میری رفیقۂ حیات کو آج شکوہ بھی یہی ہے کہ ہم تو اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر چکے تھے۔ ہمیں اس کا اتنا تو انعام ملتا کہ ہمارا سب سے اچھا بچہ ہم سے جدا نہ کیا جاتا۔ ؎

ہاں! اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی شاہدؔ
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن کیا ہماری خدمت! اور کیا ہمارا بچہ! ؎

اگر گوئی کہ عالی خاندانم — نظر بر خاندانِ مصطفےٰ کن
وگر دانی کہ بر من جبر گشتہ — نظر بر کشتگانِ کربلا کن

یہ دنیا گر کسے پائندہ بودے
ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

اندازہ ہوا کہ ہر دس انسانوں میں بمشکل ایک شخص ایسا ہوگا جو ایسے ہی

المناک سانحوں سے نہ گزرا ہو جن سے کہ ہم گزرے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ اپنی اور انسانیت کی بہبود و ترقی کے کاموں سے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں؟ کیا دل شکستہ ہو کر اور ہاتھ پیر توڑ کر خانہ نشین ہو جاتے ہیں؟ دیکھئے علامہ سلیم پانی پتی مرحوم فرماتے ہیں۔

مثلِ پروانہ تم اک پل میں جلنا سیکھو ــــــ تا سحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو

دل کو کرنا ہے اگر سوزِ محبت میں کباب ــــــ کروٹیں آگ کے بستر پہ بدلنا سیکھو

زندگی نام ہے حرکت کا، تم افسردہ نہ ہو ــــــ نبض کے خون کی مانند اُچھلنا سیکھو

عزم جو دل میں ہو پورا اُسے تم کر کے رہو ــــــ طفلِ سرکش بنو اور ضد سے مچلنا سیکھو

چشمۂ آب ہو تم، سوتے ہو کیوں زیرِ زمیں ــــــ سنگِ خارا کے شگافوں سے اُبلنا سیکھو

نہ ڈرو صدمۂ طوفان سے، مانندِ نہنگ ــــــ ورطۂ بحر کی آغوش میں پلنا سیکھو

آنچ سے رنج و مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو ــــــ موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنا سیکھو

ہے کٹھن منزلِ تسلیم تو پروا کیا ہے ــــــ سر کے بل دھارِ تلوار کی چلنا سیکھو

کلفتِ دہر سے کیوں ناک چڑھاتے ہو بھی ــــــ اس مئے تلخ کے دو گھونٹ نگلنا سیکھو

ہو کے پامالِ حوادث نہ ترقی سے رکو
دوب کی طرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو

ہماری تمام تر جزع و فزع کمزوریٔ ایمان اور نصب العین حیات پر پورا ایقان نہ ہونے کا نتیجہ ہے ورنہ اس عالمِ فانی میں سوائے ذات باری تعالیٰ کے ہر ذی روح کو جلد یا بدیر فنا ہونا ہے۔ ــــــ

بس نامور بزیرِ زمیں دفن کردہ اند ــــــ کز ہستیش بروئے زمیں یک نشاں نہ ماند

شہیدِ ملّت

تعلیم ...... سے ...... سیاست تک!

(دسمبر ۱۹۵۱ء)

مصائب اور بھی تھے ــــ دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

دسمبر ۱۹۴۵ء میں جب "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے سالانہ اجلاس آگرہ میں نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب صدر ہوئے تو ان کے نام کے ساتھ "قائد ملت" کا قومی خطاب سب سے پہلے راقم نے اشتہارات میں لکھا لیکن قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے کام اور نام کی دھوم کے سامنے وہ کچھ زیادہ چالو نہ ہوا۔ اس کی مقبولیت اس وقت ہوئی جب حضرت قائد اعظم کے وصال کے بعد ایک سخت طوفانی دور میں انھوں نے ملک و قوم کی شکستہ کشتی کی ناخدائی کی اور "بانی پاکستان" کے بعد "معمار پاکستان" کا کامیاب پارٹ

ادا کیا۔

۱۹۳۲ء کی بات ہے، ہماری پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس یو-پی کا سالانہ اجلاس بریلی میں ہوا، راقم استقبالیہ کمیٹی کا جوائنٹ سکریٹری تھا، پہلی بار ان کو دیکھا اور دور سے دیکھا، نہایت سنجیدہ، پُر رعب اور بہت اونچے قسم کے صاحب بہادر تھے، غالباً یہ پہلا قومی جلسہ تھا جس کی انھوں نے صدارت فرمائی تھی، ہماری صوبائی کانفرنس بہت غریب تھی، نواب زادہ صاحب کی بڑی تعریف ہوئی کہ انھوں نے بڑی قابلیت کا خطبہ دیا اور ساتھ ہی کانفرنس اور مقامی اسلامیہ ہائی اسکول کو گرانقدر عطیات دئے۔

عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ صدر صاحبان صدارت کرکے اور اخباروں میں بڑا دھوم دھڑکا کراکر غائب ہوجاتے، پھر ان کی رسید بھی نہ ملتی، نواب زادہ صاحب عجیب قسم کے صدر ہوتے کہ اجلاس کے بعد بھی اپنے فرائض انجام دیتے رہے انھوں نے مسلمانان یو-پی کے ۴۰ چالیس تعلیمی مطالبات، کو قائد اعظم کے چودہ نکات بنا دیا، اور وزارت تعلیم حکومت صوبۂ متحدہ کی جان کو آگئے، کافی کوشش کے باوجود بھی گورنمنٹ ٹس سے مس نہ ہوئی تو کانفرنس مذکور کا ایک اور اجلاس اپنے وطن مظفر نگر میں راجہ صاحب پیرپور کی صدارت میں طلب کرایا اور اس اجلاس میں سر جوالا پرشاد سریواستو وزیر تعلیم کو خود مسلمانوں کے مجمع میں جواب دہی کے لئے لا کھڑا کیا۔

وزیر صاحب کچھ حتمی وعدے کرنے پر مجبور ہوئے اور تھوڑے عرصہ بعد لکھنؤ میں سرکاری نمائندوں اور مسلم نمائندوں کی ایک نیم سرکاری کانفرنس ہوئی، کئی روز گرما گرم بحث مباحثے کے بعد اکثر مطالبات رسمی طور پر تسلیم کرلئے گئے۔

اب صرف ان پر عمل درآمد ہونا باقی تھا کہ اس عرصہ میں ۱۹۳۵ء کی نئی اصلاحات کے سلسلہ میں انتخابات کا ہنگامہ شروع ہوگیا، نواب زادہ صاحب سنٹرل اسمبلی میں پہنچ گئے، مظفر نگر اور لکھنؤ چھوڑ نئی دہلی میں جا بسے آل انڈیا مسلم لیگ کی تشکیل نو ہوئی جس کے وہ جنرل سکریٹری تھے اور ان کی کوٹھی گل رعنا صوبائی قومی کاموں کا مرکز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آل انڈیا قومیات کا سب سے بڑا مستقر بن گئی۔ یکم جون ۱۹۳۵ء سے راقم بھی ایک صوبائی ادنیٰ کارکن سے ترقی کرکے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر دفتر سلطان جہاں منزل علی گڑھ کا سردفتر ہوگیا تھا اور چونکہ مسلمانوں کے مسئلہ تعلیم میں نواب زادہ صاحب کی دلچسپی بدستور قائم تھی اس لئے ان سے ملنے کے علی گڑھ اور دلّی میں مواقع برابر آتے رہے۔

۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس رام پور میں تھا، ہز ہائی نس نواب صاحب رام پور صدر استقبالیہ اور ہز ہائی نس سر آغا خان صدر اجلاس تھے۔ شعبۂ تعلیم نسواں کی صدارت نواب زادہ صاحب نے فرمائی

اس موقع پر مہمانوں میں ذاتی وجاہت اور شان و شوکت کے اعتبار سے نواب زادہ صاحب کی شخصیت آغا خاں کے مقابلہ میں کچھ کم جاذبِ توجہ نہ تھی۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

صوبائی حکومتوں پر قابض و متصرف ہونے کے بعد کانگریس نے سب سے زیادہ جس چیز پر توجہ کی وہ یہ تھی کہ رائج الوقت نظامِ تعلیم کو بدل دیا جائے۔ تبدیلی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ بھی چاہتی تھی لیکن ایسی نہیں کہ مسلمانوں کی زبان، کلچر اور ملی انفرادیت کا خاتمہ ہو جائے، لہٰذا کانگریس کی رسوائے زمانہ واردھا اور ودیا مندر اسکیموں کا کانفرنس اور لیگ دونوں نے مل کر مقابلہ کیا۔ کانگریس کی ان تعلیمی اسکیموں کا سب سے زیادہ زور یو۔پی اور سی۔پی میں تھا چنانچہ نواب زادہ صاحب نے کانفرنس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں میں اعلیٰ اقتدار کے مالک ہونے کی بنا پر بڑی سرگرمی دکھائی، نواب صدیق علی خاں صاحب نے ودیا مندر اسکیم کے خلاف قانون شکنی کا اقدام کیا اور جیل چلے گئے تو نواب زادہ صاحب فوراً ناگپور تشریف لے گئے اور اپنے رفیق نواب صاحب کو قید سے چھڑا کر مسلمانوں کے حق میں ایک باعزت سمجھوتہ کرایا۔ یو۔پی میں نئی تعلیمی اسکیم کا زور بندھا اور پانی سر سے اونچا ہونے لگا تو

۹ و ۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو سلطان جہاں منزل علی گڑھ کے ہال میں صوبائی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک خاص اجلاس کی نواب زادہ صاحب نے صدارت فرمائی اور اس موقع پر ایسا ڈٹ کر خطبۂ صدارت دیا کہ اگر ایک طرف شکستہ دل مسلمانوں کی ہمت بندھ گئی تو دوسری طرف مخالفینِ اسلام کے ایوانوں میں تہلکہ مچ گیا، اس معرکۃ الآرا خطبہ کا ایک گرجدار فقرہ مجھے اب تک یاد ہے۔ فرمایا:-

"ہم نے اپنے پیارے وطن کی خاطر عربی چھوڑی، ترکی چھوڑی، فارسی چھوڑی، اب کہا جاتا ہے کہ اردو بھی چھوڑ دو، تو ہم سے یہ نہیں ہو سکتا، ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

اسی اجلاس ہی کے ایک رزولیوشن کی تعمیل میں نواب زادہ صاحب کی صدارت میں کانگریس گورنمنٹ کی شائع کردہ "ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی تنظیم جدید کی رپورٹ"... کا مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی غرض سے ایک سب کمیٹی کا تقرر ہوا جس کے جلسے ۷ اور ۸ اگست اور ۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو علی گڑھ میں ہماری بعوس کی بنگلیا میں ہوئے جو میرے مکان اور دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل کے درمیان چمن میں واقع تھی، اول الذکر تاریخوں میں نواب زادہ صاحب بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے اور دو روز تک مسلسل ہم لوگوں کو ان کی مہمانی کا شرف حاصل رہا۔ بحث و گفتگو کی روشنی میں سب کمیٹی کی رپورٹ

کا مسودہ تیار کرنے کی خدمت میرے سپرد ہوئی، ۱۰ ستمبر ۱۹۳۹ء کو اس مسودہ پر غور کرنے کے لئے کمیٹی کا دوبارہ جلسہ ہوا جس میں نواب زادہ صاحب تشریف نہ لاسکے لہٰذا نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا سید طفیل احمد صاحب، پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب اور خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب پر مشتمل ایک وفد دہلی گیا اور حسب معمول مسلم لیگ کے دفتر دریا گنج سے نواب زادہ صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ فرمایا "آجاؤ"۔

کوٹھی گل رعنا کے اس حصہ میں جسے ہم لوگ شیش محل کہتے تھے اور جو پائیں باغ کی جانب تھا نشست ہوئی، مولوی حسن ریاض ایڈیٹر منشور بھی موجود تھے۔ لیموں کے شربت اور سگریٹ سے تواضع ہوئی، پان میرے ساتھ تھے، ایک پان انھوں نے بھی کھایا، دیر تک حسن ریاض صاحب سے سیاسیات پر اور مجھ سے علیگڑھ کے بارے میں تبادلۂ خیال فرماتے رہے، پھر رپورٹ پڑھی کافی غور اور محویت کے ساتھ اسے بہت پسند کیا، ضروری ترمیمیں بھی کیں اور دستخط فرمائے۔

یہ تھی وہ مشہور "لیاقت علی خاں تعلیمی رپورٹ" جس کا یو-پی اور دہلی کے پریس میں مخالف و موافق کافی عرصہ تک چرچا رہا۔ مجھے رخصت کرتے وقت دریافت کیا "اب کہاں جائیے گا؟" عرض کیا کہ آپ کے دفتر جاؤں گا۔ قدرے حسرت سے فرمایا، دفتر تو آپ کی کانفرنس کا ہے جب ہم بھی لیگ کے دفتر کے لئے اپنی ذاتی عمارت بنالیں گے تو اسے دیکھئے گا، میں ہنسنے لگا، مشاغل تعلیمات

[illegible] ہوئے اپنی لائبریری کے دروازہ پر پہنچے تو فرمایا "آئیے آپ کو نئی کتابیں دکھائیں"، کواڑ کھول کر کمرہ میں داخل ہوئے، کرتا پائجامہ پہنے ہوئے تو تھے ہی [illegible]فی کے ساتھ کتابوں کی الماری کے پاس فرش پر بیٹھ گئے، ان دنوں بیسک (BASIC) انگلش کی کتابیں ہندوستان میں نئی نئی آئی ہوئی تھیں، انہیں نکال کر میرے ہاتھ میں دیدیا اور فرمایا کہ انہیں غور سے دیکھئے۔ آپ لوگوں کو بھی چاہیے کہ بیسک اردو کا ایک کورس تیار کریں۔

دس پندرہ منٹ ان کتابوں کو دیکھتا رہا اس عرصہ میں وہ دوسری کتابوں کو الٹتے پلٹتے رہے، میں نے کتابوں کی تعریف کی اور اجازت لے کر رخصت ہوا، راستہ بھر میرے دل پر اس ملاقات کا اثر رہا۔

———— ❋ ————

۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہونے والا تھا [illegible] کس عنوان سے نواب زادہ صاحب اجلاس سے چند روز قبل [illegible] تشریف لائے، یونیورسٹی یونین کی جانب سے ان کے اعزاز میں [illegible] ہوا "معزز مہمان" کی حیثیت سے بیچ کے بڑے صوفہ پر تشریف [illegible] ہمیشہ کی طرح وہاں تک رسائی میں نے اپنے اوپر ممنوع کر رکھی تھی، [illegible] رہا، ایک دفعہ آنکھیں چار ہوئیں تو مسکرا کر اشارہ سے بلایا اور [illegible] بٹھا لیا۔ اور میں صوفے کے کنارے پر ٹک گیا، خیریت و مزاج پرسی کے

بعد فرمایا:۔
"الطاف صاحب! میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہماری شہری اور ضلع مسلم
لیگیں سالوں سال بیکار رہتی ہیں، جلسوں اور جلوسوں کے علاوہ
ان کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا فرصت ہی فرصت کی وجہ
سے کارکن آپس میں بھی لڑتے رہتے ہیں، اور پارٹی بندی ہوتی
ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کی مصروفیت کا کچھ سامان کیا
جائے، ان لوگوں کو تعلیم بالغان کا کام سپرد کرنا چاہئے
آپ ایک اسکیم بنا دیجئے اور دیکھئے لاہور سیشن سے پہلے ہی
اس کی دو کاپیاں مجھے بھیج دیجئے، ایک دلی کے پتہ پر اور ایک
لاہور کے پتہ پر تاکہ میں جہاں بھی موجود ہوں مجھے مل جائے
لیگ کے لاہور سیشن میں تعمیری کام کا ایک ریزولیوشن پیش
کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں، اس وقت یہ اسکیم میرے ہاتھ میں
ہونی چاہئے"۔
میں نے تعمیل ارشاد کا وعدہ کیا اور ان کے اپنے خیالات اس بارے
میں معلوم کر کے نوٹ کئے، مزید فرمایا کہ:۔
"ایک کورس بھی تیار ہونا چاہئے جو آپ کی کانفرنس ہی شائع کرے
ہم آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے مقامی لیگوں کو اس کی خریداری کے

متعلق ہدایتی سرکلر جاری کر دیں گے۔ اس سے آپ
کی کانفرنس کو علاوہ شہرت کے مالی فائدہ بھی ہوگا"۔
میں نے عرض کیا کہ ہماری کانفرنس لائبریری میں چالیس پچاس پرانے سیٹ
موجود ہیں، ان پر ایک سرسری نظر ڈال لیجئے جس قسم کا سیٹ آپ پسند
فرمائیں گے اسی نمونہ کا نیا سیٹ تیار ہو جائے گا۔ فرمایا:۔
"اچھا تو کل صبح سب سیٹ آپ میرے پاس لے آیئے"۔
نواب زادہ صاحب جب کبھی مسلم یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹو کونسل یا کانووکیشن
(جلسہ تقسیم اسناد) وغیرہ میں علی گڑھ تشریف لاتے تو نواب صدر یار جنگ
بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کی کوٹھی "حبیب منزل"
میں قیام ہوتا، اس مرتبہ بھی وہیں مقیم تھے، نواب صاحب سے خصوصی تعلقات
کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ نواب زادہ صاحب کے مشہور خاندانی وقف
کرنال کے آنریری سیکریٹری تھے اور علم و فضل اور وجاہت ذاتی و صفاتی
میں ایک بے مثل شخصیت کے مالک تھے، چنانچہ قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا
قیام بھی حبیب منزل ہی میں ہوتا، نیز ایک مرتبہ میر عثمان علی خاں نظام
دکن بھی وہاں آئے، الغرض دوسرے روز صبح کو حسب وعدہ اردو کتابوں کے
چالیس پچاس سیٹ لے کر میں نواب زادہ صاحب کی خدمت میں حاضر
ہوا، فوراً ملاقات ہوئی، اس وقت شیو فرما رہے تھے اور ریزر کا بلیڈ گھ

کھڑ بول رہا تھا، کہنے لگے، میرے چہرے کے بال بہت سخت ہیں بہت دیر میں شیو ہوتا ہے اور ایک دفعہ میں بلیڈ بیکار ہو جاتا ہے، لہٰذا وہ شیو کرتے رہے اور میں کتابیں دکھاتا رہا۔ فرمایا مجھے اندازہ نہ تھا پہلے سے اس قدر کتابیں موجود ہیں، لیکن آپ تو ان سب کو سامنے رکھ کر ایک نیا سیٹ ہی تیار کرائیے جس کی لکھائی چھپائی بھی عمدہ ہو اور مضامین ایسے ہوں کہ ان سے قوم میں ایک تازہ جوش اسلامی پیدا ہو جائے، میں مقصدی تعلیم کا قائل ہوں"

میں نے عرض کیا انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا لیکن پہلے آپ اسکیم لاہور میں پاس کرائیے، فرمایا:۔

ہاں وہ تو آپ میرے پاس بھیج ہی رہے ہیں"

اس عرصہ میں نواب زادہ صاحب کا شیو اپنے جملہ لوازمات کے ساتھ مکمل ہو چکا تھا اور چہرہ پر ایک خاص قسم کی بشاشت طاری تھی، اب انہیں غسل فرمانا تھا اس لئے میں ان سے رخصت ہو گیا، چند روز میں راقم نے سب کام چھوڑ کر اور دن رات محنت کر کے مسلم لیگ کے لئے تعلیم بالغان کی اسکیم تیار کی اور خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب سے اس پر نظر ثانی کرا کر حسب ہدایت اس کی دو کاپیاں بذریعہ رجسٹرڈ پیکٹ دہلی اور لاہور روانہ کر دیں، لیکن چونکہ مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں خداداد طور پر پاکستان کا رزولیوشن پیش ہو کر منظور ہوا اور اس نے غیر معمولی اہمیت اختیار کی

جس نے آئندہ لیگ کے لائحہ عمل ہی کو یکسر تبدیل کر دیا اس لئے کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ نواب زادہ صاحب نے اسکیم مذکور کا کیا کیا؟

——— (×) ———

۱۹۴۰ء سے نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست اور معتمد خاص ہونے کی وجہ سے سیاسی کاموں میں ایسے ہمہ تن مصروف ہوئے کہ ان سے تعلیمی و اصلاحی کاموں میں زیادہ وقت صرف کرنے کی طرف سست رفتاری کی توقع ہی بے کار تھی دوسرے اب تو ان کے سامنے ایک استاد سلطنت اسلامی کا نصب العین تھا جس کے حصول کے بعد مسلمانوں کے جملہ قومی امراض کا خود بخود علاج ہونے والا تھا، اپنی زمین، اپنا آسمان ہو گا، تعمیر ملی کے تمام شعبوں میں جتنی چاہیں گے بلند و بالا عمارات بنا لیں گے، تاہم چونکہ نواب زادہ صاحب کا قیام دہلی میں رہتا تھا، تعلیمات سے ان کو فطری لگاؤ تھا، اس لئے عدیم الفرصتی کے باوجود دہلی یونیورسٹی اور عربک کالج اور اسکولز سوسائٹی کی ترقی و اصلاح کے واسطے تھوڑا بہت وقت نکال ہی لیتے تھے، دہلی یونیورسٹی کے کام میں مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی تحریک و تشویق کارفرما رہتی تھی، اور عربک کالج وغیرہ نیز سنی وقف بورڈ میں مولوی عظمت اللہ صاحب دہلوی (حال ایڈووکیٹ کراچی) ان کی دلچسپی کو قائم رکھتے تھے، خود مسلم لیگ

کی جانب سے بھی ایک تعلیمی کمیٹی قایم کی گئی تھی جس کے پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم، مسٹر جمیل الدین احمد۔ ایم۔ اے، ڈاکٹر افضال حسین قادری اور ڈاکٹر ایم ایم۔ احمد خاص خاص کارکن تھے۔

نواب زادہ صاحب نے اسلامیہ کالج پشاور کے مشہور قضیہ کو بحسن و خوبی طے کرایا نیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انتظامیہ میں بھی جب کبھی کوئی اہم تبدیلی ہوتی تو ان کی گراں مایہ شخصیت ضرور کارفرما نظر آتی تھی۔

——— (٭) ———

سنٹرل اسمبلی کے انتخابات ختم ہو گئے تھے اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات در پیش تھے کہ ۲۷، ۲۸، ۲۹، دسمبر ۱۹۴۵ء کو جناب مفتی محمد انتظام اللہ صاحب شہابی کی حسن تدبیر سے آگرہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا چوّن واں سالانہ اجلاس منعقد ہونا قرار پایا اس وقت قائد اعظم کے بعد پورے ملک میں نواب زادہ صاحب سے زیادہ بڑی کوئی دوسری شخصیت نہ تھی، اور ان کی شہرت و ناموری پورے عروج پر تھی اس لئے قدرتاً صدارت کے لئے ان کو ہی راضی کیا گیا۔ تاریخ اجلاس سے ایک دن پہلے بذریعہ کار مع صاحبزادگان و بیگم صاحبہ جن کو زنانہ تعلیمی نمائش کا افتتاح کرنا تھا آگرہ تشریف لائے، شہر سے باہر ٹھیکیدار مستجاب خاں صاحب کی

پر سکون کوٹھی میں قیام ہوا، اطلاع ملتے ہی مسٹر مسعود الحسن نقوی کو ہمراہ لے کر ان سے ملا، حسب معمول بڑی پر جوش اور لطیف ملاقات ہوئی اور میں نے ان کو اجلاس کے تفصیلی پروگرام سے آگاہ کیا، دوسرے روز نواب محمد فیاض خاں صاحب کی کوٹھی سے بعد دوپہر صدر منتخب کا جلوس نکلا، ایسا جلوس آگرہ کی تاریخ میں اس کا جواب نہ تھا، روانگی جلوس سے پہلے نواب زادہ صاحب کوٹھی کے وسیع و کشادہ مردانہ صحن میں پھولوں کے ہاروں سے لدے ہوئے آکر بیٹھے، سیکڑوں آدمی ان کے گرد حلقہ بنائے کھڑے یا بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی دور مجمع کے پیچھے چبوترہ پر کھڑا اس دلفریب منظر کو دیکھ رہا تھا تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ نواب صاحب کسی چیز یا شخص کی تلاش میں چاروں طرف نظریں ڈال رہے ہیں، مجھ سے نظر ملی تو ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا، لوگوں نے فوراً راستہ دیدیا، پاس پہنچا تو فرمایا کہ:-

"خطبہ میں نے انگریزی میں لکھا تھا، جلسہ میں پڑھنے کے لئے اس
کا اردو ترجمہ بہت عجلت میں ہوا ہے جو مجھے پسند نہیں ہے
جب تک جلوس جلسہ گاہ تک پہنچے آپ اس ترجمہ کو دیکھ لیجئے"

میں نے عرض کیا ..... "اور آپ کا جلوس نہ دیکھوں"؟ ہنس کر فرمایا "اس میں کیا رکھا ہے"!

قریب مغرب جب بکر گارڈن جلسہ گاہ میں جلوس پہنچا تو خطبہ کے

اُردو ترجمہ کو لئے میں پہلے سے حاضر تھا، جوں ہی نواب زادہ صاحب پرجوش
خیر مقدم کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ ڈائس پر پہنچے میں نے اسے
پیش کر دیا، فوراً ورق گردانی شروع کر دی اور میری سرخ پنسل کی اصلاحوں
کو تمام و کمال ملاحظہ فرما کر میری طرف معنیٰ خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر
فرمایا "شکریہ"۔ جلسہ شروع ہوا تو خطبہ کو بڑے ہی ٹھاٹ سے پڑھا، مجمع
نے بار بار پرجوش تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے، تالیوں کی گونج میں
جوں ہی خطبہ پڑھ کر بیٹھے تو مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ "کہئے!" میں نے عرض کیا
"کیوں نہ ہو! ماشاء اللہ"۔

کانفرنس کے اس اجلاس میں ایک رزولیوشن جناح ٹیکنیکل کالج کے
متعلق پیش ہوا اور دو لاکھ روپے چندے کی اپیل ہوئی بیس ہزار نقد اور
پچیس ہزار کے وعدے ہوئے، رزولیوشن مذکور پر نواب زادہ صاحب نے
بھی تقریر فرمائی اور دوران تقریر میں ایک دفعہ بڑے ہی جوش سے فرمایا کہ

"قائد اعظم کی ذات گرامی سے مجھے گہری عقیدت ہے اس
کی بنا پر میں مسلمانان آگرہ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ
صاحبان نے دو لاکھ روپے کی رقم فراہم کر لی تو اسی قدر
رقم میں جمع کر کے آپ کو دیدوں گا۔"

حاضرین جلسہ نے اس پیشکش پر انتہائی جوش و خروش کا اظہار کیا اور دیر

تک نعرے بلند ہوتے رہے۔ تالیاں بجتی رہیں۔

——— (*) ———

سورت کے ایک مشہور بزرگ مولانا فیض اللہ ہمدانی صاحب نے
ابتدائی تعلیم کی ایک اسکیم اور درسی کتابوں کا ایک کورس تیار کیا تھا ان کا
مشن تھا کہ پورے ہندوستان میں صرف ان کا ہی کورس رواج پذیر ہو اور
منظور ہو۔ بمبئی پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں مسٹر احمد ہارون جعفر
کی معرفت اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں مجھ ناچیز کی معرفت
سال بہ سال وہ اپنے کیس کو آگے بڑھانے کی جہد فرماتے، ان کی نظر میں کانفرنس
کے انعقاد کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ صرف ان کی اسکیم اور کتابوں
پر غور کرے، پونا، دہلی، جبلپور اور علی گڑھ کے بعد اب آگرہ میں ان کے
شاہکار کو اجاگر کرنے کا فرض میری جان حزیں پر مسلط تھا، اور میں اپنے
تجربہ اور کہنہ مشقی کے بل پر اس دفعہ بھی اپنے کو بچا رہا تھا اور مولانا تھے کہ
قدم قدم پر چاہے میں کسی حال میں کیوں نہ ہوں مجھ سے الجھ رہے تھے
بہ حسب معمول ان کو مجھ سے مایوسی ہونے لگی، تو پھر انہوں نے ایک بہت
بڑا ہاتھ مارا، یعنی سبجیکٹس کمیٹی (مجلس مضامین) کے اجلاس میں جس کی
صدارت نواب زادہ صاحب فرما رہے تھے کھڑے ہو کر میرے خلاف کافی
سخت احتجاج کیا اور اصول جمہوریت کا واسطہ دے کر نواب صاحب

سے پر زور مطالبہ کیا وہ اس ناانصافی کو روا نہ رکھیں، نواب زادہ صاحب
ایک معمر بزرگ کی ناراضی کی تاب کس طرح لاتے فوراً مجھ سے جواب
طلب کیا، میں نے صفائی میں زبانی تو ایک لفظ نہ کہا، البتہ مولانا کی اسکیم
اور کتابوں وغیرہ کا وہ بڑا بھاری بستہ جو ان کے ساتھ تھا اٹھا کر نواب
زادہ صاحب کی میز پر جاکر رکھ دیا اور کہا مجھے تعمیل ارشاد میں کیا عذر
ہوسکتا ہے، میری مظلومیت اور مولانا کے بستہ کی گراں باری دیکھ کر نواب
زادہ صاحب اور سارا مجمع ایک دم ہنس پڑا۔

مولانا بھی کچی گولیاں کھائے ہوئے نہ تھے، انھوں نے جو اپنے خلاف
یہ رنگ دیکھا تو تڑپ کر ایک ہی جست میں نواب زادہ صاحب کے پاس
پہنچ گئے اور ہاتھ پکڑ کر بولے:۔

جناب والا معاف کیجئے! آپ مجھے یوں نہیں ٹال سکتے"

قصہ کوتاہ نواب زادہ صاحب کو بھی ہار ماننی پڑی اور مولانا کی اسکیم کی
تائید میں ایک محتاط سا رزولیوشن کانفرنس نے پاس کردیا۔

یادش بخیر! اگست ۱۹۵۱ء میں ہمارے محترم مولانا ہمدانی صاحب
عارضی پرمٹ پر کراچی تشریف لائے تھے اور آتے ہی انھوں نے دفتر آل پاکستان
ایجوکیشنل کانفرنس کو اور مجھے ڈھونڈ نکالا۔ ملاقات ہوتے ہی زور آزمائی
شروع ہوگئی، ان کا کہنا تھا کہ میری کتابوں اور اسکیم کے بارے میں تمہاری

کانفرنس نے نواب زادہ صاحب کی صدارت میں رزولیوشن پاس کیا ہے اب کہ
نواب زادہ صاحب ایک وسیع مملکت کے وزیر اعظم ہیں۔ اس لئے ان کا فرض
ہے کہ وہ میری کتابوں کو سارے پاکستان میں جاری کرنے کا حکم صادر کردیں۔ اس پر
میں نے عرض کیا کہ احمد ہارون جعفر صاحب چاہیں گے تو آپ کا یہ کام ہوجائے گا۔
مولانا اس پر احمد صاحب کے پاس پہنچے اُنھوں نے حلیم صاحب کے پاس بھیج دیا۔
حلیم صاحب نے مسٹر امتیاز محمد خاں ڈائرکٹر تعلیم کراچی کو ٹیلیفون کردیا۔ خاں صاحب
موصوف ہمارے حلیم صاحب کی طرح مولانا سے واقف نہ تھے۔ اس لئے اُنھوں نے
ٹالنے کی بات کی اور مایوس کردیا۔ مجبوراً پھر میرے پاس آئے اور میں نے
ان کو جناب نواب صدیق علی خاں صاحب کی بہت ثنا و صفت کردی، لیکن
وہاں تک رسائی نہ ہوئی اور احمد ہارون صاحب ہی نے مولانا کی سفارش
ایک طویل عرضداشت پر دستخط کرکے جناب فضل الرحمان صاحب وزیر تعلیم کی خدمت
میں روانہ کردیا اور مولانا خوش خوش نواب زادہ صاحب اور ان کے وزیر تعلیم کو
دعائیں دیتے ہوئے اپنے وطن سورت واپس ہوگئے۔

ایک روز کانفرنس کے شب کے اجلاس آگرہ میں ہنگامہ ہوگیا۔ جن صاحب
... ہونا تھا وہ ڈائس پر تشریف رکھتے تھے۔ لہذا مجمع کا پرجوش حصہ
ان کے ہاتھ میں آیا لے کر ڈائس پر چڑھ گیا۔ دس پندرہ منٹ تک نواب زادہ
صاحب کے بالکل سر پر ایسی ہڑبونگ ہوتی رہی کہ الامان والحفیظ! بالآخر
... خود فرو ہوگیا۔ لوگ اپنی اپنی نشستوں پر آکر بیٹھ گئے اور جلسہ کی
کارروائی جس جگہ سے رکی تھی وہیں سے پھر شروع ہوگئی۔ نواب زادہ صاحب

اس پورے عرصہ میں حیرت انگیز سکون کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے، مُنہ پھیر کر
بھی نہ دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے، بڑے اطمینان کے ساتھ سگریٹ پر سگریٹ
پیتے رہے۔

اس کے دوسرے دن آگرہ کے مشہورہ "جوتا بازار" کی چھت پر نواب زادہ
صاحب کے اعزاز میں شان دار ایٹ ہوم ہوا۔ تو اس موقع پر دورانِ تقریر میں
البتہ غالباً متذکرۂ بالا ہنگامہ کے پس منظر ہی سے متاثر ہو کر ایک لاجواب
چبھتا ہوا فقرہ ارشاد فرمایا: "میں آپ صاحبان کا شکرگذار ہوں کہ آپ نے
چائے سے میری تواضع کی کسی اور چیز سے نہ کی۔"

اس کے بعد نواب زادہ صاحب سے ہندوستان میں صرف دو ملاقاتیں اور ہوئیں۔ ایک
جنوری ۱۹۴۶ء میں مصطفےٰ کیسل میرٹھ میں اور دوسری ۱۰ر اگست ۱۹۴۶ء کو ہوٹل امپیریل نئی دہلی
میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اُس اجلاس میں جس میں کہ کیبنٹ مشن پلان نامنظور کیا گیا تھا۔

غالباً ۱۰ر اگست ۱۹۴۷ء کو نواب زادہ صاحب پاکستان آئے۔ مجھے جون ۱۹۵۰ء تک
علی گڑھ نے نہ چھوڑا۔ یکم جولائی ۱۹۵۰ء کو کراچی پہنچا۔ لیکن ملاقات کا کوئی خاص عنوان نہ ہونے
کے باعث افسوس ہے کہ شرفِ نیاز حاصل نہ کر سکا۔ ۱۹۵۱ء میں عید الفطر کے موقع پر اور ۱۴ر اگست
کو یوم آزادی کے موقع پر ان کی دو ولولہ انگیز تقریریں البتہ بالمشافہ سُنیں۔ ہاں اُسی سال
موتمر عالم اسلامی کے جلسۂ افتتاح میں بھی ان کی دور سے زیارت ہوئی اور ـــ مجھے
کئی بار شبہ ہوا کہ شاید وہ مجھے دیکھ رہے ہیں لیکن ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو شہادت کے بعد
۱۸ر اکتوبر کو دھڑکتا ہوا دل لے کر "مزارِ شہید" پر حاضر ہوا تو اس وقت تو ـــ
انھوں نے مجھے ضرور ہی دیکھا ہوگا۔

علامہ سید سلیمان ندوی

(۱۹۵۳ء)

۱۴ر ربیع الاول ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ء کی شام کو ڈار منزل
چمن اسٹریٹ کراچی کے قریب ہندستان سے آئے ہوئے ایک دوست
سے ملنے گیا ہوا تھا اُس وقت دل میں برابر یہ خواہش پیدا ہوتی رہی کہ
حضرت سید سلیمان ندوی صاحب کی خدمت مبارک میں بھی حاضر ہوا
جائے کیونکہ عرصہ سے سلام نہ ہوا تھا۔ لیکن مذکورہ دوست کے یہاں کافی
دیر ہو جانے کی وجہ سے اُس روز شرفِ نیاز حاصل کرنے کا ارادہ ملتوی
کر دیا۔ دوسرے روز علی الصباح اخبار میں سید صاحب کے انتقال کی خبر
پڑھی۔ دل کو وہ صدمہ پہنچا کہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ میں نے اندازہ
کیا کہ جس وقت میں اُن کے مکان کے قریب تھا اور وہ رہ رہ کر اُن سے
ملنے کی دل میں خواہش پیدا ہو رہی تھی اُس وقت وہ اس دنیا سے رخصت
ہو رہے تھے اور ایک دیرینہ خادم و نیاز مند کو ان کی روح اعلیٰ علیین کو
جانے سے پہلے اپنی طرف بلا رہی تھی: کاش! یہ آخری ملاقات ہو جاتی!

حضرت علامہ کے آخری لمحاتِ حیات میں اُن کے مکان تک پہنچ جانے

کے باوجود یہ محرومی ایک ایسی محرومی ہے جس کا رنج کسی طرح دل سے
دور نہیں ہوتا ؂

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

حضرت کی روحِ پاک نے ہر چند اپنی کشش دکھائی لیکن ہماری بیمار و
ضعیف روح لبیک کہنے سے قاصر رہی۔ نیو ٹاؤن کی زیرِ تعمیر مسجد میں بعد نمازِ جنازہ
ہزاروں عقیدت مندوں نے چہرۂ مبارک کی زیارت کی۔ قطار در قطار لوگ
سعادت اندوز ہو رہے تھے لیکن میرے نادم و مجروح پندار نے اس کی اجازت
نہ دی۔ جب زندگی میں حقِ عقیدت و محبت ادا نہ کیا تو مرنے کے بعد چہرۂ اقدس
کی زیارت کا مجھے کیا حق تھا۔

قیامِ پاکستان سے قبل راقم کا قیام علی گڑھ میں تھا اور علامہ صاحب کا
مستقر اعظم گڑھ یا اس کے بعد بھوپال تھا۔ بُعدِ مکانی کے باعث سال میں
ایک دو بار شرفِ ملاقات کا عنوان آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا
سالانہ اجلاس اور مسلم یونیورسٹی کی مختلف کمیٹیوں کے جلسے ہوتے تھے۔
تقسیمِ ملک کی انقلاب آفرینیوں نے جہاں بکثرت ہمہ وقت کے ساتھیوں کو
دور کر دیا وہیں گاہے گاہے ملنے کو قریب سے قریب تر کر دیا۔ اب سے
چند سال پہلے یہ چیز کبھی خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی کہ حضرت علامہ سید
سلیمان ندوی صاحب اور راقم ایک ہی شہر کے ساکن ہو جائیں گے۔ لیکن انسانی
فطرت بھی عجیب و غریب ہے۔ ایک خواہش ہوتی ہے جس کی تکمیل کی آرزو

میں وہ دن رات تڑپتا ہے، جب وہ حاصل ہو جاتی ہے تو اُس کی مساوات
سی ہو جاتی ہے، جب تک کسی نعمت پر دسترس ہوتی ہے اُس کی قدر نہیں ہوتی۔
جب وہ ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو حیرانی اور ملال ہوتا ہے کہ ہائے ہم نے یہ نہ
کیا اور وہ نہ کیا۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی صاحب پر اُن کے وصال کے بعد ہر شخص
اظہارِ رنج و غم کر رہا ہے اور اُن کی ذات ستودہ صفات کے تمام گوشوں اور پہلوؤں
پر اپنی اپنی بساط کے موافق زورِ قلم اور زورِ بیان صرف کر رہا ہے کوئی دنیائے علم و
فن کے ایک ناقابلِ تلافی نقصان کے نقطۂ نظر سے اور کوئی دین و مذہب اور
ملک و ملت کے ایک حادثۂ جانکاہ کے زاویۂ نگاہ سے علامہ کے سانحہ جدائی پر
خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ لیکن خود علامہ اب اُس جگہ ہیں جہاں ان کو ان چیزوں
سے کامل بے نیازی ہے۔ جب تک اس عارضی و فانی دنیا میں رہے۔ اپنی جان اور
اپنا آخری قطرۂ خون تک ایک مقصدِ عظیم و بلند کے لئے جو انہیں اپنے استاد علامہ
شبلی نعمانی نور اللہ مرقدہٗ سے ورثہ میں ملا تھا جد و جہد کرتے رہے۔ زمانۂ دراز
تک اُن کی کوششیں نتائج کے اعتبار سے کامیاب ہوتی رہیں لیکن ان کی قیمتی زندگی
کے آخری تین چار سال جبکہ مہارتِ علم و فن انتہائی عروج پر پہنچ چکی تھی ناقدر شناس
زمانے کے ہاتھوں اُن کو مایوسی اور سخت مایوسی کا منھ دیکھنا پڑا۔ خدائے بزرگ و
برتر کی طرف سے وقت معیّنہ پر اُن کا انتقال ہونا ہی تھا اور اس سانحہ کو جس قدر
بھی جانکاہ کہا جائے کم ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس سے بھی بڑا حادثہ اُس
وقت پیش آیا جب وہ ایسے حالات اور ماحول سے دو چار ہو گئے کہ کام کرنا

چاہتے تھے اور انھیں کام کرنے کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ اس زمانہ میں جب جب اُن سے ملاقات ہوئی اُن کو رنجور اور حسرت و یاس کا مجسمہ پایا۔ فرماتے تھے کہ۔

"صاحبانِ اختیار اور صاحبانِ دول مجھے بلاتے ہیں۔ اظہارِ عقیدت کرتے ہیں۔ اہم مسائل میں تبادلۂ خیال اور مشورہ کرتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ "لو سلیمان! یہ ہے تمہارے درد کا علاج"

عرصہ کی صبر آزما خاموشی کے بعد ۹ر اپریل ۵۲ء کو پاکستان پارلیمنٹ میں آنریبل نواب مشتاق احمد خاں گورمانی وزیر اُمورِ داخلہ اور اُس وقت کے آنریبل وزیرِ تعلیم کی تائیدِ خاص سے کراچی میں ایک "سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے قیام کا ریزولیوشن منظور ہوا۔ جس پر ملک کے تمام علمی حلقوں میں اظہار امتنان و مسرت کیا گیا۔ راقم نے بھی اپریل ۱۹۵۲ء کے العلم میں تجویزِ مذکور کے پرجوش خیر مقدم میں اداریہ لکھ کر اسے درج ذیل شعر کا تاج پہنایا ؎

زیں تنگنائے خلوتم خاطر بہ صحرا می کشد
کز بوستاں بادِ سحر خوش می دہد پیغام را

یہ شعر میں نے مجوزہ اکیڈیمی میں حضرت علامہ کی ذاتِ گرامی کا تصور کرکے لکھا تھا، چنانچہ اس کے بعد جب ملاقات ہوئی تو فرمایا کہ آپ کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔ آپ نوجوان ہیں، ایسی باتوں سے خوش ہو لیتے ہیں۔ میری مایوسی بدستور ہے۔"

پھر ایک اور ملاقات میں حضرت نے خود اپنے بل پر ایک "دارۃ المصنفین"

کی مجوزہ عمارت اور علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے دارالاقامہ اور کتاب خانہ وغیرہ کے نقشے دکھائے۔ آپ کے پیشِ نظر اس ادارہ کے درج ذیل مقاصد تھے :-

"چونکہ دینی اور دنیوی تعلیم کے دو علیحدہ علیحدہ نظاموں نے ہم میں دو ایسے گروہ پیدا کر دئیے ہیں جو ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ اس کا حل یہ ہے کہ پورا نظامِ تعلیم بدل دیا جائے۔ لیکن جب تک یہ نہ ہو فوری طور پر حسبِ ذیل کام کیا جائے۔

(۱) ایک ادارۂ علمی قائم کیا جائے جس میں قابل اساتذہ ہوں۔ اور چند اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو وظیفہ دے کر اس ادارہ میں تربیت و تعلیم دی جائے تاکہ وہ لوگ جدید مسائلِ زندگی سے بھی پوری طرح واقف ہوں اور اسلامی تعلیمات کا گہرا علمی نظر پیدا کر لیں۔

(۲) اس ادارہ میں ایک وسیع کتب خانہ ہو۔

(۳) اس میں ایک مطبع ہو جو ان اساتذہ اور طلبہ کی تحقیقات کے نتائج کو کتابوں کی صورت میں شایع کرے۔

(۴) طلباء اور اساتذہ کے تحقیقی مقالے اور مضامین ایک ماہوار رسالہ میں بھی شائع ہوں۔

(۵) معاملات کے حصہ فقہ کو موجودہ دور کی ضروریات کو زیرِ نظر رکھ کر ازسرِنو مرتب کیا جائے۔

(۶) تاریخ، مضامین سائنس اور ادبیات کو اسلامی نقطۂ نظر سے قدیم و

جدید تحقیقات کی روشنی میں مرتّب و مدوّن کیا جائے۔

کروڑوں اربوں روپے کے دار السلطنت کراچی میں اور دُنیا کی
سب سے بڑی سلطنتِ اسلامی پاکستان میں موجودہ دَور کے یگانۂ روزگار
عالم و محقق کی مندرجہ بالا اسکیم روبراہ نہ ہوسکی اور آں مرحوم مغفور
آخری ایام حیات چند لاکھ روپے کی فراہمی کے انتظار میں ضائع ہو گئے
انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ہمارے وطن عزیز پاکستان میں جہالت پسندی کے دل بادل
بدیر چھٹ جائیں گے۔ بڑے بڑے دار العلوم اور تحقیقاتِ علمی کے ادارے
بھی ضرور قائم ہوں گے لیکن ان کی سربراہی کے لئے علامہ سید سلیمان
جیسا بالغ نظر اور پختہ کار رہنما کیسے نصیب ہوگا یہی وہ عظیم قومی و ملی نقصان
ہے جس کا ہمیں سب سے زیادہ احساس ہے۔

حضرت علّامہ سید سلیمان ندوی صاحب اپنے اُستاد محترم علّامہ شبلی
نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح قریب قریب ہر سال کانفرنس کے اجلاس
سالانہ میں کسی ایک جلسہ کی صدارت کے واسطے تشریف لایا کرتے تھے
اُردو، شعبہ تصنیف و تالیف اور شعبۂ اسلامی تاریخ و تمدن میں آپ کے
خطباتِ صدارت اور عالمانہ مقالات قیمتی دستاویزات کی حیثیت رکھتی ہیں
میں پاکستان میں کانفرنس کا احیاء ہوا تو حضرت نے ۲ راپریل ۱۹۵۱ء کو

اہم جلسۂ عام کی صدارت فرمائی جس میں ادارہ کا نیا دستور العمل منظور ہوا
اور عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ایک
معزز رُکن اور شعبۂ تصنیف و تالیف کی صدارت کے عہدوں پر خود علّامہ کا
انتخاب ہوا۔ آخر الذکر حیثیت سے ۵ر اکتوبر ۱۹۵۲ء کو آپ نے ہماری ایجوکیشنل
کانفرنس کے پاکستان میں پہلے اجلاس سالانہ کی صدارت فرمائی۔ اس
موقع پر آپ نے اہل علم کی زبوں حالی اور علم و فن کی ناقدری کے موضوع
پر ایک نہایت ہی اثر انگیز تقریر فرمائی۔

حضرت نے کانفرنس کے شعبۂ تصنیف و تالیف کو اپنی ایک بے بہا
کتاب "عہدِ اسلامی میں ہندوؤں کی تعلیم" بھی مرحمت فرمائی جس کو ہم اُردو،
انگریزی اور بنگالی میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔

حکیم شریف الزّماں

۱۹۵۴ء

"العلم" میں مصر کے حریت پسند شاعر ولی الدین یکن کے حالات میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں یکن کے ایک مقالہ بعنوان "مشرق میں ادیب کس طرح مرتے ہیں؟" کا اقتباس ہے:-

"ہمارے ادیب جب مرتے ہیں اُس وقت نہ صرف خیالات ومعانی کی تجلیات اُن کے دماغوں میں بجھ جاتی ہیں بلکہ اُن کے گھر ویران اور اُن کی قبریں شکستہ دکھائی دیتی ہیں"

حکیم شریف الزّماں صاحب شریف اکبر آبادی ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۴ء کو لالو کھیت کی ایک جُھگّی میں کچھ عرصہ بیمار رہ کر انتقال کر گئے اور خاموشی کے ساتھ "خاموش کالونی میں" سپردِ خاک ہو گئے۔ تھوڑے زمانے تک اُن کے متعلقین کو اُن کی قبر کا نشان یاد رہے تو رہے۔ باقی لوگوں کو پتہ بھی نہ چلے گا کہ اس غیور۔ دیندار اور علمی انسان کی آخری آرام گاہ کہاں ہے۔ حکیم صاحب کی رُباعیات "مصنف" علی گڑھ

اور "العلم" میں کبھی کبھی شائع ہوتی رہی ہیں۔ نہایت پاکیزہ خیال اور ثقہ شاعر ہونے کے علاوہ فارسی دانی اور فارسی نثر و نظم کا قلم برداشتہ ترجمہ کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی پریس اور صدر دفتر کانفرنس میں میرے ایک معزز رفیق کار کی حیثیت سے مدتوں مجھ سے وابستہ رہے۔ پاکستان آ کر انجمن ترقی اردو میں ملازم ہو گئے تھے۔ چونکہ طبعاً منکسر المزاج خاموش اور درویش صفت انسان تھے اس لیے دُنیا نے اُن کو کبھی نہ جانا۔ ہمارے ملک میں حکیم صاحب جیسے کتنے گلِ سر سبد یوں ہی بن کھلے مُرجھا جاتے ہیں۔

صاحبزادہ شہزاد احمد خاں

(سنہ ۱۹۵۴ء)

آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم سابق ممبر انڈیا کونسل اور سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پانچ وجیہہ وشان دار صاحبزادوں میں سے تین (۱) صاحبزادہ خورشید احمد خاں سابق چیف کمشنر دہلی (۲) صاحبزادہ شمشاد احمد خاں بیرسٹر ایٹ لا سابق جج ریاست بڑودہ اور (۳) صاحبزادہ شہزاد احمد خاں سابق کلکٹر گوالیار سکریٹری علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن وٹریژرر مسلم یونیورسٹی۔ ایک سال کی قلیل مدت میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ صرف دو بھائی باقی رہ گئے۔ (۱) صاحبزادہ آباد احمد خاں ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور (۲) بریگیڈیر صاحبزادہ انیس احمد خاں۔

یہ دونوں پاکستان میں ہیں اس لئے علی گڑھ میں آفتاب منزل کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ اور سب بھائی تو بالعموم ملازمتوں کے سلسلہ میں باہر رہا کرتے تھے۔ شہزاد احمد خاں صاحب آفتاب منزل علی گڑھ میں رہ کر امکان بھر اپنے نامور والد کی جانشینی کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یونیورسٹی اور ایجوکیشنل کانفرنس کے مسائل سے ہمہ وقت وابستہ رہتے اور ایک مشہور گھر کی روایات میزبانی کو بھی پورا کرتے تھے۔ نمازی ملنسار اور ذی اثر انسان تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اُن کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

علامہ عبداللہ یوسف علی

(سنہ ۱۹۵۳ء)

ہماری ملت کو علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل ایم بیرسٹر ایٹ لا۔ آئی۔ سی۔ ایس کے انتقال کا ایک عظیم حادثہ پیش آیا۔ آپ کا انگریزی زبان میں معرکۃ الآرا ترجمۂ قرآن مجید۔ اور دوسری بلند پایہ تصانیف رہتی دُنیا تک باقی رہیں گی۔ آپ ایک ایسے عالم ومفکر اور مبلغ اسلام تھے کہ آپ کی خدمات جلیلہ کا یورپ کے اونچے سے اونچے علمی حلقوں میں بھی ادب و احترام کے ساتھ اعترافِ خاص کیا جاتا تھا۔ آپ سیاسی ہنگاموں سے دور فنا فی العلم تھے اور علم ہی کی خدمت کرتے کرتے وطن سے دور خاموشی کے ساتھ انتقال کر گئے۔ لیکن آپ کی تصانیف ہمیشہ اپنی فیض رسانی سے موجودہ اور آئندہ نسلوں کے دل و دماغ کو منور کرتی رہیں گی۔

علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب نے سنہ ۱۹۱۰ء میں جب کہ

آپ سلطان پور (اودھ) میں ڈپٹی کمشنر تھے، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چوبیسویں اجلاس سالانہ بہ مقام ناگپور۔ سی پی کی صدارت فرمائی، اور آپ کا خطبۂ صدارت اعلیٰ انگریزی اور بیش بہا خیالات کا بہترین نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خادمِ علومِ دین کی خدمات کو شرفِ قبول عطا کرے اور ملتِ پاکستان کو اس کا نعم البدل مرحمت فرمائے۔
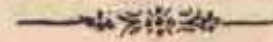
مولانا مسعود عالم ندوی

(سنہ ۱۹۵۴ء)

"محبی و مکرمی بریلوی صاحب سلام مسنون۔

ایک مدت کے بعد "العلم" کی زیارت ہوئی اور آپ کی یاد بھی تازہ ہوئی۔ پڑھا اور جی خوش ہوا۔ ماشاء اللہ معیار خاصا بلند ہو گیا ہے۔ یوں پہلے بھی پست نہیں تھا۔ سید ہاشمی صاحب کی تاریخ سے منتشر مواد کو خوب یکجا کیا ہے۔ میں نے اسے خاص طور پر حرف بہ حرف پڑھا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ آپ اور ہم دونوں پاکستان میں ہیں۔ مگر اب تک تجدید ملاقات نہیں ہوئی۔ میں بھی اس کوتاہی پر قصوروار ہوں۔ اب کی پہلی مارچ کو کراچی آنا ہو رہا ہے، آپ کی تلاش کروں گا۔ میرا قیام نظامی دواخانہ فریئر روڈ پر ہوگا۔ بڑی مرکزی جگہ ہے۔ آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ امید کہ مزاج عالی بخیر ہوگا میں بھی زندہ ہوں۔ نیاز مند مسعود عالم۔"

افسوس صد افسوس کہ صرف ۲۵ دن اور زندہ رہے۔ تقریباً ۱۶ سال کے بعد ۷ مارچ کو مولانا سید عبد القدوس ہاشمی ندوی صاحب کے دولت کدہ ہاؤسنگ کالونی میں ایک تفصیلی اور پر جوش ملاقات ہوئی اور ۱۶ مارچ کو اُن کا انتقال ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی

(۱۹۵۵ء)

تارا ٹوٹا سب نے دیکھا، پر نہ کسی نے غور کیا
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا کس کا سہارا ٹوٹ گیا

فروری ۱۹۳۱ء میں علامہ سید سلیمان ندوی صاحب نے علامہ شبلی نعمانی کے بھائی مولانا حمید الدین فراہی کی وفات پر ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ۔

" اس کی جامعیت عہد حاضرہ کا معجزہ تھی۔ عربی کا فاضل یگانہ فضل وکمال کا مجسمہ ایک شخصیت منفرد۔ لیکن ایک جہانِ دانش۔ ایک دنیائے معرفت۔ ایک کائناتِ علم ایک گوشہ نشین مجمع کمال۔ ایک بے نوا سلطانِ ہنر۔ علوم ادبیہ کا یگانہ۔ علوم عربیہ کا خزانہ۔ علوم عقلیہ کا ناقد۔ علوم دینیہ کا ماہر۔ دنیا کی دولت سے بے نیاز۔ اہل دنیا سے مستغنی انسانوں کے رد و قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے پروا۔ گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ۔ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔"

۷ راگست ۵۵ء کی صبح کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے قاضی

احمد میاں جوناگڈھی کے اچانک انتقال سے آں مرحوم کے متعلق بھی آج ہم اپنے دل میں اسی قسم کے جذبات موجزن پاتے ہیں۔ مملکت پاکستان میں علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کے بعد صحیح معنیٰ میں علمی شخصیت اگر کوئی تھی تو وہ قاضی صاحب کی تھی۔ ایسا متبحر علم ہم نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ قریب قریب ہر ایک علم وفن پر قیمتی سے قیمتی معلومات ان کی نوکِ زبان تھیں۔

قاضی صاحب کے ذاتی حالات کے بارے میں بہت کم لوگوں کو پورا علم ہے۔ انتقال آگر جیسی جیسی شدید مشکلات سے وہ گذرے اور دنیوی وجاہت وخوشحالی کی انتہا سے جس پستی میں آپڑے وہ ان کی زندگی کا انتہائی دردانگیز باب ہے صرف چند احباب خاص ان حالات سے واقف ہیں اور بس!

اللہ جزائے خیر دے علامہ آئی آئی قاضی وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی، پیر حسام الدین راشدی۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور ممتاز حسن صاحب جیسے دوستوں کو کہ انھوں نے ان کا تقرر دائمی دسمبر ۵۲ء سے سندھ یونیورسٹی میں اسلامک ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کا انچارج پروفیسر بنوا دیا تھا جس سے کچھ "آبروئے اہل نظر" ہو گئی تھی۔

ع

جب وہ جو کچھ ہوئی روشن تو قضا بھی آئی

حالات چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کو ناقابل بیان بے سروسامانی چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بمشکل چھ ماہ گذرے ہوں گے کہ ان بچوں کی ماں کا انتقال ہوا اور اب باپ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ سب سے بڑے لڑکے کی عمر صرف گیارہ سال ہے اور سب سے چھوٹی بچی دودھ پیتی ہے سہ

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

بچوں کی آئندہ کفالت کے لئے دولت اقبال کے اعتبار سے قاضی صاحب کی جولانی کی تنخواہ کا کچھ حصہ شاید گھر میں ہو تو ان طرح مر رہے ہیں ہمارے ملک کے مشاہیر اہلِ علم اور فنکار فاعتبروا یا اولی الابصار۔ قیام پاکستان سے قبل قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی۔ نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی علی گڑھ۔ نواب غلام [illegible] مدراس اور حکیم حبیب الرحمٰن ڈھاکہ کی طرح ایک عالم و محقق اور مصنف ادیب ہونے کے علاوہ صاحب ثروت جاگیردار بھی تھے۔ دولتِ دنیا اور دولتِ علم کا ان کی ذات گرامی میں اجتماع قابلِ رشک خیال کیا جاتا تھا علمی و تعلیمی سرپرستیوں اور خریداریٔ کتب میں بلامبالغہ لاکھوں روپیہ صرف کیا۔ ان کا دولت کدہ جہان بھر کے اہل علم و فن کا ملجا و ماویٰ تھا۔ کاٹھیاواڑ میں ہز ہائی نس نواب صاحب جوناگڑھ کے بعد اُن کی پوزیشن تھی۔

صوبائی مسلم لیگ کی ہمو ذن جماعت انجمن اتحاد المسلمین کے صدر تھے اور ان ہی کے مکان پر رات کے دو بجے تک انجمن کے ایک تاریخی جلسہ میں یہ طے ہوا کہ ریاست جوناگڑھ کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہونا چاہئے اس تجویز کا تو کوئی نتیجہ نہ نکلا البتہ اس کی پاداش میں ریاست میں انڈین گورنمنٹ کی جانب سے جب پولیس ایکشن ہوا تو سب سے پہلے قاضی اختر جوناگڑھی کی تلاش ہوئی۔ بہ ہزار دقت و دشواری دشمن کے ہاتھوں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور پرتگالی جزیرہ دیو میں پناہ لی۔ ایک سال تک سخت بے کسی اور عسرت

[illegible] تنگ دستی میں وہاں ایام گزاری کی۔ قیام دیو کے زمانے میں بھارت کا ہندو پریس قاضی صاحب کے خلاف مسلسل اشتعال انگیز خبریں شائع کرتا رہا کہ قاضی اختر نے دیو میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا ہے اور دس ہزار فوج بھرتی کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بھارت کے وزیر داخلہ مسٹر پٹیل کے لئے قاضی صاحب کا وجود ایک مستقل درد سر تھا۔

ع عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

قاضی صاحب کن کن تدبیروں سے جزیرہ دیو سے نکلے اور کراچی پہنچے یہ [illegible] داستان ہے، جو کبھی آئندہ سپرد قلم کی جائے گی۔ لیکن اس سے زیادہ پُر الم داستان ان کے ہفت سالہ قیام دار الامان پاکستان کی ہے۔

صوبہ بمبئی اور کاٹھیاواڑ کے درجنوں کروڑپتی مقیم کراچی سیٹھوں نے اپنی آنکھوں سے قاضی صاحب کی شان و شوکت کو دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا کہ وہ ہاتھ میں تھیلا لئے جونا مارکیٹ میں اشیاء خورد و نوش خریدتے پھر رہے ہیں یہ ممکن ہے قاضی صاحب کی خودداری مانع امداد ہو لیکن اب کہ وہ موجود نہیں رہے ان کے اہل استطاعت ہم وطنوں کا فرض ہے کہ وہ اُن کے عیش دیدہ معصوم بچوں کو [illegible] ٹھوکروں پر نہ چھوڑیں۔ میری یہ دردمندانہ اپیل قاضی صاحب کے دوست خاص جناب ممتاز حسن صاحب سکریٹری فینانس حکومتِ پاکستان[1] اور جناب آئی آئی چندریگر وزیر قانون حکومت پاکستان[2] سے بھی ہے کہ وہ ان کی دستگیری فرما کر حق دوستی ادا کریں۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے صدہا علمی و تحقیقی مقالات اور متعدد تصانیف و تالیفات بھی بطور اولادِ معنوی اپنی یادگار چھوڑی ہیں

[1] بعد کو گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان۔
[2] بعد کو وزیر بنے اور اب مرحوم۔

جن کی حفاظت اور جلد از جلد طباعت از بس ضروری ہے ورنہ کچھ عرصہ بعد ان کا یہ
سرمایۂ حیات ضائع ہو جائے گا۔ اس خصوص میں قاضی صاحب کے احباب علم
پیر حسام الدین راشدی۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ پروفیسر ہالے پوتا۔ ڈاکٹر نبی بخش
بلوچ۔ نصر اللہ خان ایم۔ اے اور علامہ میمن عبدالعزیز کی توجہ خاص کی ضرورت
ہے۔ بڑی بڑی عمارات اور بڑے بڑے شہروں اور کارخانوں وغیرہ کی تعمیر
آسان ہے لیکن دماغ کی تعلیم و تربیت آسان نہیں لاکھوں میں ایک دو
انسانوں کو قدرت اس نعمت سے سرفراز کرتی ہے اور کئی کئی جگ کی دیدہ
ریزی اور محنت شاقہ کے بعد یہ تیاری مکمل ہوتی ہے لہذا ایک مرصع و مذہب
دماغ کے نتائج کا برباد جانا ہماری نگاہ میں پوری قوم اور ایک پورے
ملک کے لئے حادثہ عظیم سے کم نہیں۔ ایک بڑے مفکر۔ شاعر۔ ادیب اور
فنکار کی اصلی موت اس وقت ہوتی ہے جبکہ حکومت اور قوم اس کی تصانیف کو
بھی اپنی بے حسی سے نسیاً منسیاً ہو جانے دیتی ہے۔

قاضی احمد میاں اختر صاحب کے انمول نتائج فکر و مطالعہ سے علمی رسائل
اور ریڈیو کے ذریعہ قوم بالعموم باخبر ہے اور ان کی اچھوتی قابلیت کا پڑھے لکھوں
کے لوگوں کو اعتراف بھی ہے ایسی صورت میں ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو
جلد از جلد زیور طبع سے آراستہ کرانا چاہیے۔

قاضی صاحب کے سرمایۂ ادب میں ان کے قلم برداشتہ لکھے ہوئے
خطوط کو بے حد اہمیت حاصل ہے جن سے ان کی پُرکار شخصیت جمال اخلاق
و روحانی بلندیوں کے ساتھ اپنے حقیقی خد و خال میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

راقم کے قاضی صاحب سے مراسلتی تعلقات کا سلسلہ ۲۸۔ اپریل ۱۹۴۲ء سے
شروع ہو کر تاریخ انتقال سے ایک دن پہلے یعنی ۵ راگست ۱۹۵۵ء تک
قائم رہا لیکن سخت افسوس ہے کہ آج تلاش کرنے پر سب خطوط محفوظ نہ
مل سکے۔ خصوصیت سے پرتگالی جزیرہ دیو کے زمانۂ قیام کے خطوط جن میں
وہ اپنے نام کے بجائے "اسیر دیو" لکھا کرتے تھے۔ قطعاً دستیاب نہ ہوئے۔
اس زمانہ میں میرا قیام علی گڑھ ہی میں تھا۔ اور اگرچہ قاضی صاحب بھارتی
حکومت کی نگاہ میں "بھوپت ڈاکو" سے کم نہ تھے اور ڈاک کے شدید سنسر کی
پابندی میں ان کو خط لکھنا یا ان کے خطوط کی تعمیل کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا
لیکن میں نے اس کی مطلق پروانہ کی اور ایک آزاد ملک کے آزاد شہری
کی حیثیت سے یہ اپنا حق سمجھا کہ میرا کوئی عزیز یا دوست کسی سنگین جرم میں
ماخوذ و مغضوب ہو گیا ہے تو مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے چاہے کچھ انجام ہو۔
اچھے حال کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں۔ برے حال میں بھی ساتھ دیا جائے تو
اشراف کی پہچان ہے۔

میری تحریک پر قاضی صاحب نے ایک محضر بھی تیار کر کے میرے پاس
بھیج دیا تھا جس میں اپنی ذاتی و خاندانی حیثیت کا ذکر کر کے اپنے اوپر ظلم و زیادتی
کے واقعات درج کئے تھے۔ میں نے اس محضر کو دہلی جا کر مولانا حفظ الرحمن
صاحب ناظم جمعیت العلمائے ہند کی وساطت سے آنریبل مولانا ابو الکلام آزاد
صاحب کی خدمت میں پیش کرایا تاکہ وہ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل سے سفارش کر دیں
مولانا صاحب نے جواب دیا کہ قاضی صاحب کی تحریر ناپسندیدہ ہے اس میں

اعترافِ جرم اور اُس کی معافی طلبی ہونی چاہیے، نیز اُنھیں پہلے جزیرہ دیو سے جوناگڈھ واپس آجانا چاہیے۔ قاضی صاحب ان اقدامات کے لئے تیار ہوئے اور واپسی، وطن مالوف کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر کے عا[illegible] پاکستان ہونے کی تدابیر میں مصروف ہو گئے۔

کراچی پہنچ کر جولائی ۵۰ء تک جبکہ میں خود بھی یہاں نہ آگیا قاضی [illegible] مجھے پابندی سے علی گڈھ خط لکھتے رہے۔ افسوس کہ یہ خطوط بھی سب [illegible] دستیاب نہ ہو سکے خاص کر وہ خط جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ "کل تک لوگ میری آنکھیں دیکھتے تھے آج آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے" تلاش [illegible] باوجود نہ مل سکا۔ بہرحال جس قدر جواہر پارے ہمدست ہو سکے [illegible] کیے جاتے ہیں۔ آئندہ بھی جس طرح قاضی صاحب مرحوم کی یاد [illegible] کبھی خالی نہ رہے گا، اُن کے ادبی شہ پاروں کی تلاش میں آنکھیں متجسس و نگراں رہیں گی۔

---

۲۸ اپریل ۴۳ء

جوناگڈھ۔ کاٹھیاواڑ۔

مکرمی، وعلیکم السلام

کرم نامہ، مورخہ ۲۴، موصول ہوا۔ رسالہ "مصنف" [illegible] میں میرا نام بھی درج کر لیں اور اس کا سالانہ چندہ [illegible]

[illegible] بذریعہ وی۔ پی بھیج کر وصول فرمالیں۔

احقر

قاضی احمد میاں اختر

(رئیس و صدر بلدیہ جوناگڈھ)

---

(۲)

[illegible]واڑہ۔ جوناگڈھ (کاٹھیاواڑ) ۲۳ مئی ۴۳ء

جناب محترم۔ السلام علیکم

معاف فرمائیں۔ کرم نامہ مورخہ ۲ اپریل کا جواب ایک ماہ کے بعد [illegible] رہا ہوں، کچھ ایسی ہی مصروفتیں رہیں۔

آپ کا رسالہ "مصنف" نہ صرف مجھے پسند ہے بلکہ ہر علم دوست کو

[illegible] گہوارۂ علم و ادب علی گڑھ میں ذوقِ علمی کی زوال پذیری سے متاثر ہو کر راقم نے [illegible] اگست ۴۲ء کو ایک "مجلس مصنفین" قائم کی جس میں ہر ماہ علیگڈھ اور بیرون علیگڈھ کے منتخب اہل علم حضرات اپنے اپنے نتائج تحقیق علمی مقالوں کی شکل میں پڑھ کر سناتے [illegible] ان پر آزادانہ نقد و تبصرہ ہوتا اور پھر یہ مقالے سہ ماہی رسالہ "مصنف" میں جو خاص اسی ضرورت کے لئے راقم کی ادارت میں فروری ۴۳ء سے جاری کیا گیا تھا شائع [illegible] جاتے تھے۔ ۲۰ مئی ۴۶ء تک مجلس مذکورہ کے ۱۶ نہایت کامیاب جلسے اور ستمبر ۴۶ء [illegible] "مصنف" کے بائیس شمارے شائع ہوئے۔

پسند آنا چاہیے۔ میرے ہموطن مولانا یمنؒ میرے مخدوم اور دیرینہ کرم فرما ہیں۔
ان کی سندِ اعتبار پر جو "انکشاف" آپ کو ہوا ہے وہ تمام تر "عین الرضا" پر مبنی ہے۔
دولت علم و دین خدا نصیب کرے، دولتِ دنیا سے بہرہ مندی بھی دوستوں کے
حسن ظن تک محدود ہے۔ رہا "بڑا آدمی" ہونا تو یہ بھی میسر نہیں۔ اعزہ و اقارب میں
سب سے چھوٹا، حلقۂ احباب میں سب سے کم عمر، رتبہ میں اکثر اقران و اماثل سے
کم تر اور علمی سرمایہ کے لحاظ سے فردِ ترقیل میتی ہے

کفی المرء نبلاً أن تعد معائبہٗ

"معارف پروری" کی نہ استعداد نہ حوصلہ جب تک "مصنف" جاری رہے آپ اسے
میرے نام جاری رکھیں مع اس اضافہ قیمت کے جو کاغذ کی شدید گرانی کے
باعث آپ کرنا چاہیں۔

احقر

قاضی احمد میاں اختر

---

(۳)

جوناگڑھ ۱۰ر جولائی ۴۲ء

سیدی المحترم۔ السلام علیکم

کرم نامہ دستیاب ہوا، شکریہ، "مصنف" نکالنے کی داد نہ دینا

لہ علامہ میمن عبد العزیز ساکن راجکوٹ (کاٹھیاواڑ) عربی ادب کے فاضلِ یگانہ سابق پیر
ڈیپارٹمنٹ و مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ
گورنمنٹ آف پاکستان کراچی۔ آپ مجلس مصنفین کے معزز رکن تھے اور آپ کی
تحریک پر میں نے قاضی صاحب کو پہلا خط لکھا تھا۔

"متعدد خطوط" لکھنے پر ایک کا بھی جواب نہ ملنے کی شکایت سر آنکھوں پر، لیکن اس یاد و شان
طرزِ تخاطب سے بہت متاثر ہوا جو اس "حادثۂ جانکاہ"ؒ کی غمازی کر رہا ہے جس کا ذکر

لہ حادثۂ جانکاہ میری ایک جواں سال حقیقی بہن کے انتقال کا تھا۔ قاضی صاحب نے "مصنف"
میں جس ادارتی شذرہ کا نوٹس لیا ہے حسب ذیل تھا:۔
"درد دل لکھوں کیونکر جاؤں ان کو دکھلاؤں انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا"
یہ سہ ماہی اچھی نہیں گذری۔ ایک حادثۂ جانکاہ نے اس قدر دل تنگ رکھا کہ زندگی
زندانِ غم بن گئی۔ لیکن اس روح فرسا سانحہ کا تعلق چونکہ محض میری ذات تک محدود ہے
اس لئے آدابِ صحافت اس کی اجازت نہیں دیتے کہ "مصنف" جیسے علمی و قومی آرگن کے
صفحات اس کے ذکر سے سوگوار کئے جائیں۔
ایک کاروباری انسان کا "تا نفس" چاہے کس قدر ہی "متفکر اثر" کیوں نہ ہو، اس کو
چاہئے کہ صرف کام کئے جائے۔ دنیا اس سے کام اور اس کے کامیاب نتائج مانگتی ہے
اور بس! مصائب و آلام سے ہمدردی کی جائے گی۔ لیکن ایک دن کے ہرج کا بھی ہرجانہ
ضرور دینا ہوگا۔
الغرض جب صورتِ حال یہ ہو تو مجلسِ مصنفین کے جلسوں کا بھی ناغہ نہ ہونا چاہئے
اور "مصنف" کی اشاعت بھی وقت پر ضرور ہونی چاہیے۔
یہ سب کام سخت انہماک۔ جوش اور زندہ دلی کا مظاہرہ چاہتے ہیں ورنہ۔ ع
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را
(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

آپ نے "ذکر ماضی" میں کیا ہے، خصوصاً اس "آخری سلام" پر تو میں چونک پڑا۔ خدا نہ کرے کہ یہ آپ کا آخری سلام ہو۔ آپ ایسے "علمی اور قومی دیوانے" کہاں ملتے ہیں ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

(۵) اس متعدد خطوط کی تشریح بھی سن لیجئے۔ اب تک مجھے آپ کے صرف ۳ خطوط ملے ہیں جن میں سے پہلے خط کا جواب عرض کر چکا ہوں۔ دوسرے خط میں اسی مضمون کی تکرار تھی اس لئے انقضائے مدت کا منتظر رہا۔ تیسرے خط کا جواب حاضر ہے اس پر امتحان لینے، انصاف نہ کرنے، داد نہ دینے اور ہمت افزائی نہ کرنے کے چار چار سنگین الزامات عاید کئے گئے ہیں۔ ع

داورِ حشر ترے ہاتھ ہے عزت میری

کاش ان میں کوئی الزام صحیح ہوتا ؎

بڑا مزہ ہو جو محشر میں کروں شکوہ!
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کیلئے

بقیہ صفحہ گذشتہ (سلہ)

لہذا کیا مجال جو ادائے فرض میں کوتاہی، طبیعت میں اضمحلال اور چہرے پر پژمردگی ظاہر ہو۔ کام ہو گئے اور ہوتے رہیں گے۔ اُن کی تعریف بھی ہو رہی ہے اور تعریضیں بھی اور دونوں جماعتوں کا کامیاب مقابلہ بھی جاری ہے۔

یہ ہے انسان اور اس کی زندگی۔ سچ ہے "انسان کی زندگی کائنات کا سب سے زیادہ پوشیدہ راز ہے"۔

جو مصنف "نکالنے" کا سخت کام انجام دینے والے کی داد نہ دے، بلکہ اس کا امتحان لے، وہ مصنف کا صحیح "قدر دان" کیسے ہو سکتا ہے؟ جو "انصاف اور ہمت افزائی نہ کرنے کا قصور وار ہو وہ قدر دانِ مصنف کے زمرہ میں کیسے شمار ہو سکتا ہے" سوائے اس کے کہ یہ آپ کی کرم فرمائی اور قدر افزائی ہے اور کیا عرض کر سکتا ہوں؟

رہا مصنف، تو اس کی قدر و منزلت کا یہ حال ہے کہ تمام ضروری کاموں کو چھوڑ کر اور تمام علمی رسائل سے منہ موڑ کر اس کے مطالعہ کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ اسی سے آپ اندازہ لگالیں گے کہ مصنف کو میں کس نظر سے دیکھتا ہوں۔ مصنف میں اب تک جو مضامین شائع ہو چکے ہیں وہ میرے نزدیک نصابی درجہ رکھتے ہیں اور موقت دلچسپی کی چیز ہونے کی بجائے مستقل علمی مقالات ہیں۔ جو بار بار مطالعہ کے قابل رہتے ہیں۔ اس کا ایک نمبر دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نکل رہا ہے اور یقیناً داد کا مستحق ہے۔

چھٹے نمبر کی داد بھی دینے نہ پایا تھا کہ ساتواں نمبر آپہنچا۔ اس نمبر میں اچھے اچھے اور قابل مطالعہ مضامین ہیں خصوصاً مسئلہ علم پر مولانا راغب[1] کا مسلسل مضمون اکبر الہ آبادی کی شاعری[2] اور ادبیاتِ جدید فارسی

---

[1] مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی استاد دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ۲۰ر فروری ۱۹۴۸ء کو انتقال ہوا مجلس مصنفین کے رکن تھے علم ہیئت و نجوم سے خاص ذوق تھا۔ علامہ بیرونی کے قانونِ مسعودی کے کچھ اجزاء کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔

[2] اسلم عباسی، بی۔ اے (علیگ) رئیس گورکھپور۔

بھی خوب لٹے ہیں۔ سلاطین گجرات کی تاریخی کتب پر معمولی مضمونچہ لکھ کر صدیق مکرم چغتائی[2] صاحب نے ٹالا ہے۔ حالانکہ اس سے معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ تاریخ گجرات کے مآخذ پر ایک مفصل مقالہ کی ان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ پھر عنوان بھی کچھ مغالطہ انگیز ہے۔ اس کی بجائے "سلاطین گجرات کی تاریخ کے مآخذ" زیادہ صحیح عنوان ہو سکتا ہے۔ سلاطین گجرات کی تاریخ کے عربی مآخذ پر میں آج کل ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ "تاریخی نوادر" اور "اردو نثر کے بہترین نمونے اور تبصرے" - یہ عنوانات آپ نے خوب اضافہ کئے ہیں جو پڑھنے والوں کے لئے خاص دلکشی رکھتے ہیں اور مصنف کا طرۂ امتیاز ہیں لیکن نثر اردو کا جو نمونہ اس وقت پیش کیا گیا ہے اس کو شاید انتخاب کرنے والے نے اپنے "جذبات" کی رعایت سے پسند کیا ہے۔ ورنہ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ تبصرہ کے زیر عنوان "اعمال نامہ"[3] کا حق تنقید پورا ادا ہوا ہے۔ اس کتاب کو حال ہی میں ختم کر چکا تھا کہ یہ تبصرہ دیکھا اور اس کی ہر ہر سطر سے اتفاق کرتے ہوئے کہنا پڑا ؎

دیکھنا "تنقید" کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

[1] از ڈاکٹر راجہ غلام سرور سابق استاد شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی حال پروفیسر کراچی یونیورسٹی مجلس مصنفین علی گڑھ کے سرگرم کارکن تھے۔

[2] ڈاکٹر عبداللہ چغتائی سابق ریسرچ آفیسر دکن کالج ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونا حال مقیم لاہور۔

[3] خود نوشت سوانح حیات سر سید رضا علی مرحوم۔

کتاب مذکور کے متعدد تبصروں میں اس سے بہتر اور کوئی تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ ایک سید[1] نے دوسرے سید کے اعمال نامے کا خوب جائزہ لیا ہے کما قیل۔ الحدید یفلح بالحدید۔

آپ کے "ضبط و تحمل" کی داد دیتے ہوئے ایک حقیر رقم برائے مصنف ارسال خدمت کر رہا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ "صحیح قدر دان" ہونے کا جو الزام آپ نے لگایا ہے وہ انشاء اللہ مصنف کے دم تک صحیح ثابت ہو کر رہے گا۔ احقر (اختر)

---

(۴)

علی گڑھ .... مارچ ۱۹۴۳ء

شفیق محترم - السلام علیکم

کتاب "اعمال نامہ" کے متعدد تبصروں میں سید اظہر رضوی کے تبصرہ سے بہتر اور کوئی تبصرہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تبصرہ ایک اور تبصرہ چاہتا ہے ایسا راست راست بے کم و کاست تبصرہ شاید ہی کبھی دیکھنے میں آیا ہو۔ سید اظہر حسین صاحب تبصرہ نگاری کے لئے بہت موزوں معلوم ہوتے ہیں ایسے بے لاگ نقاد اور تبصرہ نگار ہماری قوم میں

[1] سید اظہر حسین رضوی ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) سابق ایڈیٹر "روزنامہ جناح" حیدرآباد دکن حال مقیم کراچی۔ عزیز موصوف حکیم سید شمس اللہ قادری مرحوم اڈیٹر "تاریخ" حیدرآباد دکن کی تشویق پر تکمیل تعلیم کے لئے علی گڑھ آئے تو چار سال تک راقم سے وابستہ رہے۔ کبھی کبھی "مصنف" کے لئے کتابوں کے تبصرے لکھتے تھے اور مجلس مصنفین کے جلسوں میں شرکت کی بھی انہیں اجازت خاص حاصل تھی۔

آج مفقود ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے اسلاف رَحِمَ اللّٰہُ مَنْ اَهْدَىٰ اِلَیَّ عُیُوْبِی کی دعائیں دیتے تھے۔ آج ان کے اخلاف اپنے اعمال کی ذرہ بھر تنقید برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں ؎

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا   ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

اعمال نامہ کا تبصرہ 'معارف' میں بھی دیکھا مرنجان مرنج مبصر (نقاد نہیں) اُن مقامات کی صرف تحسین (تنقید نہیں) کرتا ہوا گزر گیا ہے، یہ بھی ایک خوشگوار اسلوب ہے لیکن وہ دقتِ نظر اور جامعیت کہاں جو مصنف کے نقاد کی تنقید صحیح میں پائی جاتی ہے اور یہی ہمارے نقاد کی بلندیٔ فطرت اور مذاق صحیح کا ثبوت ہے۔ اگر سید رضا علی صاحب کی جگہ میں ہوتا تو اس کی والویں دیتا کہ کتاب کے ہر نسخہ کے ساتھ اس کو چھپوا کر تقسیم کرتا مگر یہ وصف تو کچھ انھیں جانبازوں کے ساتھ مخصوص تھا جو قرونِ اولیٰ کے خیر الامتہ میں گزرے ہیں لیکن ہندی و مغربی ماحول نے اس صفت کو ہم سے چھین لیا۔ آہ۔ غالباً سودا ہیں ؎

دلِ ستم زدہ بے تابیوں نے لوٹ لیا
ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا

آپ کا۔ اختر

---

(۵)

جوناگڑھ کاٹھیاواڑ   ۹ر اگست [illegible]

شفیق کرم السلام علیکم

کرم نامہ ۳۰ر جولائی موصول ہوا۔ ممنون و مسرور فرمایا۔ آپ کے

حسنِ طلب کا تو میں پہلے سے قائل ہوں، اس پر معذرت کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ "سلاطین گجرات کے عربی ماٰخذ"[1] پر میرا مضمون اصل انگریزی میں لکھا گیا تھا، اس کا اردو ترجمہ دو ایک روز میں تیار ہو کر ارسالِ خدمت ہوگا۔

اردو نثر کے نمونوں کے سلسلے میں ایک استدعا یہ ہے کہ جب یہ کافی تعداد میں اکٹھے ہو جائیں تو اسی نام سے ان کا ایک مجموعہ مع مختصر حالاتِ اربابِ نثر شائع کر دیا جائے۔ یہ اُردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔

رسالۂ معارف بابت ـــــ کے شذرات[2] میں سید سلیمان صاحب ندوی نے مسز سروجنی نائیڈو پر اظہارِ خیال فرمایا ہے جو میرے خیال میں نثرِ اردو کے بہترین نمونوں میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ اس تحریر میں ناقدانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ایک طرح کا حسین انداز اور بانکپن نظر آتا ہے جو سید صاحب کی دوسری تحریروں میں نہیں پایا جاتا۔ اگر آپ اس کو شائع کریں تو اس کی نقل کرا کر بھیج دوں۔

پروفیسر میمن صاحب اپنے وطنِ مالوف راجکوٹ میں براج رہے ہیں جو یہاں سے ۶۰ میل کی مسافت پر (تین گھنٹہ ریل سے) واقع ہے۔ حسبِ معمول اگلی مرتبہ بھی وہ یہاں چند روز کے لئے ضرور تشریف فرما ہوں گے اس وقت

۱؎ "مصنف" بابت جنوری ۱۹۲۵ء میں یہ مضمون شائع ہوا اور مقبول ہوا۔

۲؎ شذرات "معارف" بابت جنوری ۱۹۱۵ء کا تراشہ قاضی صاحب نے ارسال فرمایا جو زیرِ عنوان "اُردو نثر کے بہترین نمونے" "مصنف" اکتوبر ۳۶ء تا جنوری ۳۷ء میں شائع ہوا۔

آپ کا سلام موصوف سے عرض کر دوں گا۔

زہے نصیب جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس یہاں منعقد ہو! اگر ایسا ہوا تو آپ سے تفصیلی ملاقات کا موقعہ نصیب ہوگا۔ خدا ایں چنیں کند!

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

آپ کا مخلص احقر
اختر

---

(۶)

قاضی ولا۔ جونا گڑھ — دسمبر ۴۴ء

شفیق مکرم۔ السلام علیکم

بیت المصنف کا افتتاح مبارک ہو۔ سپاس نامہ مل گیا تھا۔ طرزِ نگارش کی ندرت کے کیا کہنے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ —

۱؎ راقم نے اپنے [illegible]نامہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس جونا گڑھ میں کئے جانے کی تحریک پیش کی تھی۔

۲؎ مجلس مصنفین از مصنف، کے دفتر "بیت المصنف" کی رسم افتتاح، نومبر ۴۴ء کو خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب کے ہاتھ سے ادا کرائی گئی اس موقعہ پر درج ذیل سپاسنامہ راقم نے پیش کیا جس کی حضرت قاضی صاحب داد دے رہے ہیں۔

"سر سید اور ان کے نورتن محسن الملک۔ وقار الملک۔ مولانا حالی۔ علامہ شبلی۔ مولوی سلیم پانی پتی۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی چراغ علی

(باقی فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

[بیت] المصنف کے لئے عنقریب کتابیں جمع کر کے روانہ کروں گا۔ میری [تصنیفات] بھی اس میں شامل ہوں گی۔ کچھ دن اور انتظار کیجئے۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ ۲ کا)

اور نواب عماد الملک نے ہندوستان کے سب سے بڑے تعلیمی و ثقافتی [مرکز] علی گڑھ کی ترقی پسند علمی و تحقیقی روایات کا آغاز کیا۔

عہد ثانی کے نورتن نواب صدر یار جنگ بہادر۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں۔ مولوی عبدالحق۔ مولانا طفیل احمد۔ مولانا ظفر علی [خاں]۔ سجاد حیدر یلدرم۔ مولوی عزیز مرزا اور مولوی عنایت اللہ نے روایات [علی گڑھ] کو قائم و ترقی پذیر رکھا۔

تیسرے دور کے نورتن۔ رشید احمد صدیقی۔ عبدالماجد دریابادی۔ خواجہ غلام السیدین۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ ہاشمی فرید آبادی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ پروفیسر حبیب۔ قاضی تلمذ حسین اور پروفیسر الیاس برنی نے علی گڑھ کی علمی و ادبی رونق کو چار چاند لگائے۔

پہلی محفل کے نورتن اپنی اپنی آب و تاب دکھا کر رخصت ہو گئے۔ دوسری [محفل] کے بھی کچھ نورتن داغ مفارقت دے گئے۔ عہد ثالث کے نورتن اپنی پوری درخشانی و تابانی کے ساتھ ہندوستان کی دنیائے علم و ادب کو منور کئے ہوئے ہیں۔

(باقی فٹ نوٹ ۲ اگلے صفحہ پر)

حضرت نواب صدر یار جنگ بہادر قبلہ ہماری مجلس علم و ادب کے آخری [illegible]
نشین ہیں اور اس تاریک ملک میں تیرہ بختوں کے روشن چراغ۔ اسلاف کے [illegible]
بزرگوں میں اس وقت ان کی ذات اقدس مغتنمات میں سے ہے۔ آپ نے [illegible]
موہن کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ حرف بحرف صحیح اور اس سے مجھ [illegible]
ہے اور آپ کی اس دعائے خیر میں شریک ہونے کو اپنا اسلامی اور قومی فرض [illegible]

(بقیہ از صفحہ گزشتہ [illegible])

اب چوتھے دور کا آغاز ہے۔ سپیدۂ صبح نو نمودار ہو چکا ہے، نئی تزئین او[illegible]
[illegible] ایک نیا دربارِ علم و فن ترتیب دیا گیا ہے۔

دوسرے اور تیسرے دور کے بڑے بڑے ممتاز اکابر نمایاں نشستوں [illegible]
دربار [illegible] میں بہت سی کرسیاں خالی ہیں۔

سرسید کے جانشینِ علمی اور دربارِ علم کے "صدر الصدور" کا فرمان ہے کہ اُن کو [illegible]
[illegible] کے انعقادِ دربار کی یہی غائت ہے، کون کہاں بیٹھے اور کیا کام کرے، [illegible]
فخر النسل حکیم دانا، کو سپرد کیا گیا۔

دربار علم کا نقیب (یعنی راقم عاصم) حضرت "صدر الصدور" کے ایما پر اس مبارک [illegible]
کاج کی درخواست کرتا ہے ؎

بیا کہ تازہ نوائی تراود از رگِ ساز   مئے کہ شیشہ گدازد بساغر اندازیم

[illegible] دوروں سے آمین کہتا ہوں،

مخلص
اختر

---

(۷)

علی گڑھ، ۲۷ر دسمبر ۳۲ء

کرم گستر! تحیۂ مسنون۔

الطاف نامہ نے ممنون و مسرور فرمایا۔ آپ "حُسنِ ظن" کو اس قدر تو نہ بڑھایئے
[illegible] کی رسوائی تک نوبت پہنچے۔ آپ کے ہاں "اچھی چیزیں پرائیویٹ نہیں رہتیں" لیکن میرا
خیال ہے کہ اچھی چیزوں کو پرائیویٹ ہی رہنا چاہئے۔ یہ مانا کہ آپ کو تنہا حلوا خوری کی
[illegible] ہیں، لیکن معاف فرمایئے "قند مکرر" تو کچھ تنہا ہی لطف دیتی ہے۔ بہرحال میں بھی
[illegible] اس کیفیت سے کچھ کم لطف اندوز نہیں ہوا بقول شوق قدوائی ؎

وہ خوش کہ ہیں جگر کو نظر میں لئے ہوئے
میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے

جوبلی کی تقریب نہایت سادگی سے انجام پائے گی اور سوائے چاندی میں
[illegible] کی رسم کے اور کوئی جشن وغیرہ نہ ہوگا اس لئے باہر کے لوگوں کو دعوت نامے
[illegible] جائیں گے۔ ویسے آپ آئیں تو سر آنکھوں پر صدر اور معتمد کی نیابت کی ضرورت

[illegible] نواب صاحب جوناگڑھ کی نقرئی جوبلی بہت دھوم دھام سے منائی
جانے والی تھی۔ اس موقع پر میں نے کانفرنس کا ڈیلیگیشن بھیجے جانے کے متعلق
[illegible] صاحب کو لکھا تھا۔

نہیں۔ آپ اپنی طرف سے بنفسِ نفیس رونق افروز ہوں تاکہ ہم بھی "خدا کی قدرت" کا مشاہدہ کر سکیں: جوبلی ۲۱ مارچ کو ہوگی اور آپ دسمبر کی تعطیل میں بہت دور نکل جانا چاہتے ہیں کان پور اور گورکھ پور تو بہت دور نہیں ہیں۔ البتہ جونا گڑھ کو "بہت دور" کہا جا سکتا ہے۔

کمیٹی کا جلسہ[1] آپ نے جنوری کے پہلے ہفتہ میں رکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ ہمارے ہاں پورے تین ماہ جنوری، فروری، مارچ جوبلی کے انتظامات میں صرف ہوں گے جس میں سب سے بڑا کام ۲۵ لاکھ روپے چندے کی فراہمی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ایسٹر کی تعطیل میں جلسہ کی تاریخ مقرر ہو سکے۔

آج کل مفصلات میں دورہ پر جانا پڑتا ہے اور بھی کئی مصروفیتیں ہیں ان دنوں "ڈان"[2] میں مضمون لکھنے کا شاید ہی موقع ملے۔ تاہم کوشش کروں گا۔ کتابیں اکٹھی کر رہا ہوں معقول تعداد میں جمع ہو جائیں تو کسی نیک ساعت میں ارسالِ خدمت کروں۔

اظہر صاحب کو سلام شوق اور دعائے فراواں۔ حضرت نواب صاحب قبلہ کی خدمت بابرکت میں آداب و تسلیمات۔ کہیئے مولانا یمین سے مصالحت ہو گئی[3] یا نہیں مصنف کب تک آئے گا امید کہ مزاجِ لطیف بخیر ہوگا۔

ہمیشہ آپ کا مخلص
اختر

---

[1] کمال یار جنگ ایجوکیشن کمیٹی کی سفارش کی بنا پر سر عزیز الحق صاحب مرحوم کی قیادت میں جو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا تھا اس کی کمیٹی کے ایک رکن قاضی صاحب بھی تھے۔

[2] میں نے قاضی صاحب سے فرمائش کی تھی کہ قیام انسٹی ٹیوٹ کی تائید میں ایک مضمون ڈان دہلی میں ارسال فرمائیں۔

[3] یاد نہیں رہا کہ کیا اختلاف تھا ویسے میں علامہ صاحب موصوف کو اپنا ہمیشہ بزرگ اور مخدوم سمجھتا رہا۔

(۸)

علی گڑھ .... جون ۱۹۴۵ء

شفیق محترم۔ السّلام علیکم

پرسوں مصنف باصرہ نواز ہوا مگر ہوگی کے لباس میں یہ خط اور رسالہ میں ان کے پورے خدوخال پیش نظر ہو جاتے ہیں اور میں دیر تک محو تماشا رہتا ہوں۔ اور ان کے نیازنامہ کی پذیرائی کا شکریہ۔ ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا ؟

متواتر علالتوں کے دور سے گزر رہا ہوں۔ آشوب چشم۔ اس کے بعد درد گردہ۔ پھر اسہال اور ...... ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ لیکن اس سے پیشتر ایک مرتبہ علی گڑھ میں ملاقات کرنے کی تمنا ہے[1]۔ مقالہ ولی کا حسن طلب بین تو بہت خوب رہا۔ آدمی

---

[1] علی گڑھ کے فٹ نوٹ ۲ میں راقم نے اجلاس کانفرنس کی جس تحریک کا ذکر کیا اس کو تقویت دینے کے لئے کانفرنس کے سکریٹری نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے قاضی صاحب کے نام ایک ضابطہ کا خط لکھوایا تھا جس کے ساتھ نواب صاحب موصوف نے حسب ذیل تحریر بھی شامل کی۔ عہد حاضر کے دو اساطینِ علم و ادب کا ذوقِ تحریر ملاحظہ ہو۔ (ایڈیٹر)

"کانفرنس کے ہیڈ اسسٹنٹ سید الطاف علی صاحب کو ادبی خدمات سے خاص لگاؤ ہے انہوں نے ایک خط آپ کے نام لکھوانا چاہتے تھے قلب اور قلم دونوں کو ابھارنے کے لئے آپ کا کارڈ مجھ کو دکھلایا جو آپ نے ان کو لکھا تھا۔ یقین فرمائیے کہ نقوش

ہیں کم ہے کم اتنی لطافت تو ہو۔ اظہر میاں سے کہئے کہ قفل خموشی توڑیں۔ استاد

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ سے آگے)

تحریر نے پرانے نقوش نیاز مندی کو ابھار دیا۔ کیا کیا یاد آیا۔ کیا کیا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا۔ ہیجانِ شوق میں مومن کا شعر پڑھا ہوا۔ دل نے کہا کیا نصیبا ہے۔ بیچارے مومن کی بے بسی پر

اے خوشا طالع کہ ہوں اختر شناس آسماں بھی ہے کرم ایجاد کیا

مومن اپنا شعر کہہ کر محو تاسف رہے ہوں گے۔ یہ پیام دل سن کر محو فخر و سرور ہو گیا۔ ایک ادیب ادیب سے ربط قدیم و شناسائی دلنواز بلکہ دل افروز نہیں نور بخش پھر کیونکر فخر و مسرت اس کی تجدید سے حاصل نہ ہوتی۔ یہی معراج اختر شناسی ہے۔ آپ علی گڑھ آنے کی تمنا میں ہیں علی گڑھ خود حاضر ہو کر جونا گڑھ میں سلام کا مشتاق ہے۔"

(دستخط) صدر یار جنگ

قاضی صاحب بنام نواب صاحب

"حضرت اقدس والاجناب نواب صاحب قبلہ زاد مجدکم

عطوفت نامہ نے سرفراز فرمایا یعنی۔ ع

کلاہ گوشہ اختر بآفتاب رسید

جس طرح اور جن محبت بھرے الفاظ میں آں محترم نے یاد فرمایا ہے وہ میرے لئے صد فخر و مسرت ہے اس خوش بختی پر جس قدر بھی نازاں ہوں کم ہے۔

یوں تو میرا انجم بخت اوج پہ مدت سے تھا آج ہوا ہے مگر نقطۂ وسط السما

شکریہ آں محترم کی اختر شناسی اور دلنوازی کا نہیں اس ذرہ نوازی بندہ پروری

(باقی فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

اور ہمہ دقتیں ختم ہو گئی ہوں تو کچھ قلم کے جوہر دکھائیں۔

مخلص
اختر

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ سے آگے)

وہ اور کہ مومن کے شعر کے تصرف پر خود مومن کو حسرت ہوتی ہے، مرد مومن کی یہی معراج ہے۔ پرانے نقوش نیاز آگیں دل میں مدتوں سے جاگزیں ہے۔ کہیں سے یہ حسرت نکلے کاش علی گڑھ و گڑھ کی یکجائی شوق دیدار کو پورا کر سکے۔ اور دیدار حبیب سے آنکھیں روشن ہوں۔

ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا

معلوم ہوا ہے کہ کتب خانہ حبیب گنج میں سلوتر نامی سنسکرت کتاب کا ترجمہ از عبداللہ بن صفی بعہد احمد شاہ بہمنی موجود ہے اس ترجمہ کا تھوڑا سا حال ضروری ہے ایک مقالہ "سنسکرت اور مسلمان" کے لئے درکار ہے۔ اگر خازنِ کتب کو حکم فرمادیں تو عین نوازش اور معارف پروری ہوگی۔

سلام علی نجد و من حل فی النجد

اخلاص کیش۔ اختر

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ سے آگے)

... ہے کیا لکھا تھا جس کی قاضی صاحب داد دے رہے ہیں۔ بہر حال سنا تھا کہ موصوف اپنا پیمانہ و تحقیق ریختہ گوئی کے موجد اور اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ولی احمد آبادی (گجراتی) ثابت کرنے میں صرف کر رہے ہیں۔

(۹)

جوناگڑھ ..... اکتوبر ۱۹۴۱ء

مکرمہ زاد لطفکم۔ سلام مسنون۔

"مصنف" موصول ہوا اور اپنے دامنِ سادہ مگر پرکار میں رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ لایا جو دیر تک ذہن کی تازگی کا باعث بنا رہا۔ ذکرِ ماضی و فکرِ فردا تو البتہ خود ایک مستقل دلچسپی کا راز ہے۔ لیکن کوئی مقالہ ایسا نظر نہیں پڑا جسے معیاری کہا جا سکے یا یوں کہئے کہ میری دلچسپی کا تھا۔ کوئی کلیہ استثنا سے خالی نہیں۔ اسی طرح کا ایک مستثنیٰ ہے "جنرل بخت روہیلہ" سیدہ انیس فاطمہ[۱] کا وہ فاضلانہ اور انشاء پردازانہ مقالہ جو کسی کی "شہر کی غمازی کر رہا ہے۔ جس عالمانہ تحقیق۔ ناقدانہ تدقیق اور تنقید کے ساتھ یہ مقالہ رقم ہوا ہے اس کی داد تو ہر علم دوست سے ملے گی لیکن آپ سے بھی خراج تحسین وصول کر کے رہا ہوگا۔ ع اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ

اگر کاغذ کی کمیابی کے زمانہ کے ساتھ پورے رسالہ میں صرف یہی ایک مقالہ ہوتا تو بھی یہ نمبر خاصا کامیاب رہتا۔ کاش اس سے ہمارے دوسرے تعلیم یافتہ اور بہنیں سبق حاصل کریں اور اس روشن مثال کی اتباع کر کے اپنی روشن دماغی روشن دلی سے اپنے اردو دنیا کو منور کریں۔

مخلص

اختر

۱؎ بیگم الطاف بریلوی "بزمِ ادب" میں زیادہ تر ملک کے معاشی مسائل پر لکھتی ہیں۔

(۱۰)

جوناگڑھ ..... جنوری ۱۹۴۲ء

مکرمی السلام علیکم

آپ کی علالتِ طبع اور موجودہ حالات معلوم کر کے مجھے کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا البتہ افسوس ضرور ہوا۔ "قومی کارکنوں" کی یہی گت ہوتی رہتی ہے۔ "روشنیٔ طبع" بسا اوقات انسان کے لئے "بلا" بن جاتی ہے۔ آپ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے اس لئے اب "گل دیکھیں کا گلہ عبث ہے۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ اتنی تلخ کامیوں کے باوجود آپ توازنِ دماغی کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

آپ اپنی "موجودہ کولھو کے بیل کی سی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں خدا کرے آپ میں اتنی جرأت پیدا ہو جائے۔ لیکن میرے خیال میں تو صرف یہ آپ کے لئے دشوار بلکہ ناممکن ہے اس لئے فی الحال تو مر مر کے جیے جانا ہی بہتر ہے تا وقتیکہ خدا کوئی بہتر سامان پیدا نہ کر دے۔

میں بسترِ علالت سے اٹھ تو گیا لیکن دل و دماغ بری طرح ماؤف ہو گئے اور ضعف و ناطاقتی کے ساتھ ہی تفکرات کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے دعا کیجئے کہ خدا اس سے جلد نجات دے۔ ایک جانِ ناتواں پر لاکھ جھمیلے ہیں کہ خدا کی پناہ! ؎

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزری اختر — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مقالہ کی صرف آپ کی توجہ کا کرشمہ ہے نہ آپ مجھے "بزمِ مصنف" میں بلاتے نہ میں اس کام کو انجام دے سکتا[۱]۔ حضرت قبلہ نواب صاحب کا یہ ارشاد کس قدر

۱؎ ملاحظہ ہو خط نمبر ۸

صحیح ہے کہ آپ میں ادبی خدمات لینے کا خاص ملکہ ہے، اس لحاظ سے اس مقالہ کی جو کچھ داد مل رہی ہے، اس کے مستحق مجھ سے زیادہ آپ ہیں۔ ناظر صاحب کا کوردی پروفیسر عبدالشکور صاحب اور سید حسن امام صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے قدردانی کی یہ حسنِ نظر ہے ورنہ یہ مقالہ اس قدر داد کا مستحق تو نہیں ہے بہت سرسری طور پر لکھا گیا تھا۔ البتہ اس کا دوسرا حصہ (اگر مسودہ بیضہ ہو سکا) قابل دید ہوگا بعض احباب نے بھی اس کو قدر کی نگاہوں دیکھا ہے۔ حبیب لبیب پروفیسر نجیب اشرف صاحب[2] فرماتے ہیں "ابھی ابھی معنّف ملا۔ اسی وقت آپ کا محققانہ مضمون پڑھا۔ آپ ہوتے تو گلے لگا کر داد دیتا اب زبانِ قلم سے یہ فرض ادا کرتا ہوں۔ مبارکباد۔ الموسیٰ والے مضمون کا میں نے جواب لکھا تھا اب وہ مکمل ہو رہا ہے۔ اکثر توارد ہے ایک مرتبہ پھر مبارک باد قبول فرمایئے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔"

میرے ایک دیرینہ محب مخلص جناب شہاب مالیر کوٹلوی مقیم بمبئی رقمطراز ہیں "آپ کا مرسلہ تحفہ "معنّف" ملا ملتے ہی پڑھا اور آپ کی تحقیق و تدقیق کا نقش جو دل پر پہلے ہی ثبت تھا اور گہرا ہو گیا، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ حکیم کی خاموشی

---

[1] "معنّف" بابت اکتوبر ۱۹۶۲ء میں قاضی صاحب کا معرکۃ الآرا مقالہ "ولی گجراتی" شائع ہوا۔ اس کا حجم ۲۰×۲۶/۸ سائز کے ۳۶ صفحات پر مشتمل تھا۔

[2] نجیب اشرف صاحب اسمٰعیل اندھیری کالج بمبئی کے پروفیسر اور انجمن اسلام اردو ریسرچ اکیڈمی بمبئی کے ڈائرکٹر ہیں آج کل آپ کی نگرانی میں رسالہ "نوائے ادب" بڑی دھوم دھام سے شائع ہو رہا ہے۔

وار ہو نہیں ہوتی۔ اتنے لمبے سکوت کے بعد ولی کی وطنیت کی فیصلہ کن بحث اس سکوت کا ثمرہ ہے۔ بارک اللہ بارک اللہ۔ اب معارف تو آپ کے معارف سے گویا محروم ہی ہو گیا۔ "معنّف" کی خوش قسمتی میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ دورانِ بحث میں کہیں کہیں چھیڑ چھاڑ معاصرانہ اور علمی گفتگو سے زیادہ رقابت وطنی کا رنگ لئے ہوئے نظر آتی ایسا ہونا قدرتی تھا۔ ولی کو اورنگ آبادی ثابت کرنے کے لئے حیدرآبادی اہلِ قلم نے جو روش اختیار کی اس میں دکن اور دکنی کو اساس قرار دے کر ہوائی قلعہ تعمیر کر لیا گیا تھا۔ قدیم شواہد پر تنقید و تبصرہ کے ساتھ آپ کا نئے عناصر اور تازہ شواہد کا اثبات میں شامل کر دینا آپ کی تلاش دلی کی خوش قسمتی اور اہل علم کے لئے نئی دعوتِ فکر اور اہل قلم کے لئے تلاش و جستجو کا نیا اچھوتا نمونہ ہے۔ بارک اللہ! اس پرچہ میں غلام قادر روہیلہ پر سید الطاف علی صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے۔ انھوں نے زیادہ تر عجیب التواریخ پر اعتماد کیا ہے، ضرورت ہے کہ وہ کتاب بھی چھپ جائے۔ سید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے بہت اچھا ہے، مگر اقبال کی نظم میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے اکبر شاہ خاں صاحب کے بیان کی بنا پر کمزوری کا ثبوت ملے۔ دورِ آخر مغلیہ کی تاریخ سوائے حسنِ ظن کے اور کسی طرح بھی مسلمانوں کے لئے سرمایۂ ناز و افتخار نہیں۔ مغلیہ خاندان کے عروج کی تاریخ نے ہندی مسلمانوں کے قدیم فرماں رواؤں کے محاسن کو بھی معائب نہیں بنایا تو گرد آلودہ ضرور کر دیا ہے حالانکہ مغلوں سے پہلے کے جو دور تھے ان میں بھی بادشاہ ہونے کی حیثیت سے بڑے بڑے فرماں فرما ہو چکے ہیں۔ مگر بدقسمتی ہے کہ ہندی مسلمان دورِ مغلیہ ہی کو اسلامی دور سمجھ کر قصہ ختم کر دیتا ہے۔ خیر! یہ بحث یہ تھی کہ

...... سید صاحب نے غلام قادر کے لئے جو لکھا ہے وہ بہت اچھا ہے۔ مگر سید صاحب کا یہ کہنا کہ وہ مسلم طاقت یا مغلیہ طاقت کی بحالی کی آخری کوشش کرنے والا یا آخری محافظ ہے، زبردستی ہے۔ شاہی لال قلعہ میں اس کے ساتھ جو ہوا اس کا اگر وہ بھی بدلہ لے تو اُسے کون برا کہہ سکتا ہے اور یہ تو سیاست ہے کہ طاقت ور کمزور کو دباتے ہیں لیکن سچی سیاست یہ ہے کہ کمزوری میں غلام نہ بنے۔ طاقت میں فرعون نہ بنے۔ ایسا ہی شخص فرماں روائی کا مستحق ہے۔ نگاہیں ایسے ہی لوگوں کو ڈھونڈ رہی ہیں[1]۔ "حیاتِ ولی" کا احباب کی طرف سے سخت تقاضا ہو رہا ہے۔ میں نے بہت کچھ حصہ لکھ ڈالا ہے اس کو صاف کرنا باقی ہے جو موجودہ مصروفیتوں میں بالفعل دشوار ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ ماہ میں اس کام کو شروع کروں میں نے اس کے دو حصے کر دیے ہیں۔ پہلے حصہ میں ولی کے خاندان اور ذاتی حالات ہیں اور دوسرے میں ان کی شاعری پر مفصل بحث ہے۔ پہلا حصہ حتی الامکان جلد سے جلد جنوری کے اواخر تک تیار ہو سکتا ہے، دوسرا حصہ ذرا محنت طلب ہے اور اس پر بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ جو کافی وقت اور فرصت چاہتا ہے۔ غلام قادر کے مضمون پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اچھا اب خدا حافظ!

مخلص
اختر

---

[1] یہ مقالہ راقم نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ علی گڑھ ... میں پڑھا تھا۔ انگریزی متن ڈان اور ہسٹاریکل جرنل میں شائع ہوا۔ اردو ترجمہ ... بابت اکتوبر ۱۹۴۵ء میں طبع ہوا۔

(۱۱)

جوناگڑھ ۔ ۲۴ر فروری ۱۹۴۶ء

محب مکرم، زاد الطافکم، سلام مسنون

کرم نامہ مورخہ ... دستیاب ہوا۔ میں گاؤں پر تھا۔ اس لئے جواب میں دیر ہوئی۔ الیکشن میں آپ کی ناکامی[1] کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں۔ مگر مجھے اس سے ایک گونہ مسرت ہوئی، قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ علم و ادب کا خادم سیاسیات کے خارزار میں اُلجھ کر رہ جائے۔ آپ نے جن "رذائل اخلاق" کا تماشا کیا وہ دور سے بھی کہہ دیں یا وہ "جنت نگاہ" نہ تھے، یہ "فریب نظرہ" نہ تھا، بلکہ "فریب نفس" تھا جس نے آپ کو دور سے "بہشت شداد" کا نظارہ دکھا دیا! بہرحال جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔

عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم

آپ نے بڑی مزے کی بات کہی کہ "محدود دلچسپیوں کے لوگ مزے میں رہتے ہیں" لیکن آپ جن کو "دلچسپیاں" کہتے ہیں، میں ان کو زحمتیں سمجھتا ہوں، ورنہ "دلچسپیاں" وہ کتنی ہی لامحدود ہوں آدمی کو ہمیشہ مزے میں رکھتی ہیں، اور ان سے وہ کبھی "بے مزہ" نہیں ہوتا۔

آپ اس وقت ایک بہت "بڑی بلندی" سے نیچے آرہے تھے۔ وہ خیالی

---

[1] یو پی لیجسلیٹو اسمبلی کے حلقۂ بہیڑی (ضلع بریلی) و تحصیل ... سے امیدوار ممبری بننے کے لئے ... نے یو پی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ میں لیگ ٹکٹ کے لئے درخواست دی تھی جو بورڈ ... کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کے ایک ہم برادری کے مقابلہ میں مسترد ہو گئی۔

۔سر بلندی" جو آنے دن کے تفکرات یا "انکار" سے ہمیشہ آپ کے سر کو نیچا رکھتی۔ شکر ہے
کہ یہ "طلسم" جلد ٹوٹ گیا۔ اب اس پر ڈراپ سین ڈال کر اسے ختم کر دیجئے۔ اور طبیعت
کا رنگ بدلنے کے لئے چند روز یہاں چلے آئیے۔ اگرچہ انسٹی ٹیوٹ کے دورہ پر نکلنا
اس وقت میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ رہا دل لگنا، تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ
یہاں کے مناظر خصوصاً دیہاتی زندگی سے آپ کا دل ضرور بہل جائے گا۔ "معنف"
مل گیا۔ اڈیٹوریل تو پورا کانفرنس کی نذر ہو گیا ہے۔ آپ نے "بزم معنف" کو تذکرۂ فوائد
سے علحدہ رکھا ہے۔ یہ بہت اچھا کیا۔ لیکن میں اس تقدیم و تاخیر کو پسند نہیں کرتا۔

نواب صاحب قبلہ پر بہت مفصل مقالہ چھپا ہے، اس کے باوجود حضرت
موصوف کی ادبی حیثیت پر روشنی نہیں ڈالی گئی اور اس لحاظ سے وہ بہت تشنہ
ہے۔ اُن کی انشا پردازی تنہا اظہارِ خیال چاہتی ہے۔ میں ان کو اردو کے اساتین
میں سے سمجھتا ہوں، اور طرزِ انشاء کے لحاظ سے "آزاد ثانی" اور آزاد ثانی ...
کو ان کے بعد۔

بہن انیس فاطمہ کا مقالہ "حضرت محل" پر جہاں اپنے مخصوص طرز
بیان کے لحاظ سے "خاصے کی چیز" ہے، وہاں تاریخی تحقیق و جستجو کا بہترین
نمونہ ہے۔ کسے مبارک باد دوں؟ اُن کو، یا آپ کو؟ کم سے کم
"مسلم ہیروئنس آف انڈیا" پر ان کے قلم سے ایک مفصل کتاب
کی توقع بیجا نہ ہوگی۔ غالباً یہ "ادبی تخلیق" آپ کے لئے بھی ...

---

۱ از مولوی عبدالشاہد خاں شروانی۔ شائع شدہ "معنف" بابت جنوری ...

باعث سکون ہوگی۔

مقالۂ ولی پر تصحیح و استدراک کے عنوان سے ایک تحریر عنقریب پہنچے گی۔
اس کے بعد تذکرہ ولی بھیج دیا جائے گا۔

کلکتہ والے مولوی نذیر احمد کا مضمون "ہندوستان کے کتب خانے"
انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مئی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں چھپا ہے۔ اظہر صاحب سے
کہئے کہ وہ نقل کرا کر بھیج دیں۔

راجستھانی صاحب اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں آپ کو
سلام عرض کرتے ہیں۔ اظہر میاں کو سلام و دعا۔

مخلص
اختر

---

(۱۳)

...... اپریل ۱۹۴۶ء

شفیق محترم۔ السلام علیکم

... کے سلسلے میں ہمارے ایک پنجابی دوست پروفیسر عبداللہ ڈاکر گجرات

---

۱ انیس فاطمہ بریلوی کے "معنف" میں شائع شدہ تین مقالے (۱) جنرل بخت خاں
... (۲) حضرتِ محل۔ اودھ کی جانباز ملکہ اور (۳) ضیاء الملک جنرل محمود
... ۱۸۵۷ء کے ہیرو" کے نام سے کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ کتاب مذکور پر
... پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۶ء
... سے شائع ہوا۔

کالج احمد آباد نے اپنے خط میں مقالہ کی بعض ضمنی اور جزئی باتوں پر اعتراضات کئے ہیں جن میں سوا ایک کے سوا باقی زیادہ اہم نہیں ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ میں آپ کی مقالہ ایک استدراک لکھ کر بھیجوں جس میں ان اعتراضات کا جواب بھی ہو جائے اور غلطیاں رہ گئی ہیں اُن کی تصحیح بھی ہو جائے۔ ساتھ ہی بعض امور کی تشریح ہو۔

علی گڑھ سبحان اللہ خاں لائبریری میں وؔلی کا قلمی دیوان موجود ہے ذرا وہ دیکھ کر بتائیے کہ اس میں کتنی غزلیں ہیں۔

۲۔ کس سال لکھا ہوا ہے اور کاتب کون ہے۔

۳۔ کہاں آگے پیچھے کوئی عبارت لکھی ہوئی ہے۔

۴۔ مصنف کا نام سرورق پر یا آخر میں دیا ہے یا نہیں۔

۵۔ خط اور کاغذ کیسے ہیں۔

مخلص
اختر

---

(۱۳)

جوناگڈھ ۶ر مئی ۱۹۵۷ء

مکرمی! مدتوں سے آپ نے نصف ملاقات سے محروم رکھا ہے اس سے قبل دو نیاز نامے حاضر خدمت ہو چکے ہیں جن میں سے ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ خط مصنف میں نظر سے گزرا جس سے فدویار تک اپنی رسائی کا ثبوت دیا یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اب آپ اپنے علمی دائرے کو وسیع

کرتے جا رہے ہیں اس کا بیّن ثبوت "روہیلہ" کا جنم ہے۔ پیش از وقت مبارک باد قبول فرمائیے۔ "مصنف" میں ابکی مرتبہ عزیزہ انیس فاطمہ آپ کی اسسٹنٹ کے طور پر نظر آ رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر مہدی مرحوم کا یہ فقرہ یاد آ گیا۔

"عذرا میری اسسٹنٹ ہو تو اردو لٹریچر میں جان پڑ جائے"

مہدی مرحوم کو تو عذرا ملی ہو یا نہ ملی لیکن آپ کی خوش قسمتی میں کیے شک ہو سکتا ہے خدا سے دعا ہے کہ یہ جوڑا اپنی ادبی اور علمی تخلیق میں بھی "مکاتبہ" کا ثبوت دے اور زبان و ادب کی خدمات سے تمام ملک کو فائدہ پہنچائے۔ آمین۔

عزیزہ سیدہ ابکی مرتبہ بجائے مضمون نگار کے "نقاد" بن گئی ہیں لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں خطرناک نہ ثابت ہو ان کے تبصرے یوں تو بہت پر لطف ہیں "نیا دور ترقی" کے تبصرے میں اُنھوں نے غضب کیا کہ اُردو کے ایک افسانہ نویس کو زندہ درگور کر دیا اُن کے بعد والے "بزرگ" کے ساتھ اگر یہ سلوک ہو تو مناسب نہ تھا۔ لیکن یہ بے چارے تو ابھی ڈھلتی ہوئی چھاؤں بھی نہیں ہیں۔ ان کے والد مرحوم مولوی سید ممتاز علی صاحب کے بجائے خود ان کا نام ہوا ہوتا ہے۔ ہاں نگار کے انتقاد نمبر کی تنقید میں یہ فقرہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

"وہ ایک ایسی کسوٹی ہیں جس پر سونا کندن بنتا ہے" کیا سونے اور کندن میں کوئی فرق ہے۔ آگے چل کر فرماتی ہیں۔

"مستقبل میں اُنھیں کی بنائی ہوئی شاہراہوں پر چل کر ہماری نوخیز نسلیں اُردو کو دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان بنا سکیں"

"انھیں" (انہی) کی ضمیر یہاں نیاز (فتح پوری) صاحب کی طرف راجع ہوتی ہے، حالانکہ تنقید نگار کی طرف راجع ہونی چاہئے۔

آپ کے کاتب صاحب کی یہ ستم ظریفی ہے کہ انھوں نے میرے پچھلے خط میں "ادبی تحقیق" کو "ادبی تخلیق" لکھ دیا ہے۔ اگر آپ "توہین اولادنی" کی رعایت سے ایسا کیا ہے تو خیر ورنہ اس میں معاملہ ازالۂ حیثیت عرفی تک پہنچ جاتا ہے۔ خیر خدا ایش بیامرزد۔ "بزم مصنف" میں شیخ ممتاز حسین صاحب[1] کے اس فقرے سے بہت لطف اندوز ہوا کہ میں اور مولوی طفیل احمد صاحب[2]۔ میر ولایت حسین[3] اور خان بہادر حبیب اللہ خاں صاحب[4] بالکل سرسید مرحوم کی طرح ہمدرد مسلم...

---

[1] شیخ ممتاز حسین صاحب جون پوری ثم لکھنوی جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا شیعہ پولیٹکل کانفرنس۔ نگراں روزنامہ سرفراز۔ اور فن خطاطی کے مشہور ماہر، راقم کی دعوت پر موصوف علی گڑھ تشریف لائے اور "مجلس مصنفین" کے ایک خصوصی جلسہ میں "خط اور اس کی مختصر تاریخ" کے عنوان پر ایک محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ پڑھا جو "مصنف" بابت مارچ ۶۲ء میں شائع ہوا۔ ابھی حال میں انتقال ہوا۔ آخری دم تک خدمات علمی وقومی میں مصروف رہے۔

[2] موصوف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" کے مصنف ایجوکیشنل کانفرنس اور مجلس مصنفین کے اکابر میں سے تھے اور بلند پایہ مقالات مجلس میں پڑھے جو "مصنف" کے مختلف شماروں میں شائع ہوئے۔ ... مارچ ۶۲ء کو انتقال ...

[3] خان صاحب میر ولایت حسین صاحب مرحوم سابق سپرنٹنڈنٹ ایجوکیشنل کانفرنس۔

[4] زہد وورع۔ صدق مقال اور صفائے کردار کے اعتبار سے نمونے کے بزرگ تھے۔

... اس پر مولوی بشیر احمد کی وہ تحریر یاد آگئی جس میں انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم۔ مولانا حالی اور مولانا شبلی کو اردو شاعری کا اتحاد ثلاثہ کہا ہے۔

"مقالہ اولیٰ کی تصحیح "واستدراک"[1] پر ایک مضمون لکھ کر روانہ کیا ہے۔ رسید سے مطلع فرمائیں۔"

آج کل یہاں دکنی کے دیوان کی اشاعت جدیدہ پر ایک مضمون قلمبند کر رہا ہوں اور اس وقت جوناگڑھ سے ۱۴ میل کی مسافت پر دیہات میں مقیم ہوں نسبتاً یہاں گرمی کم ہے۔ برسات سے پہلے گھر پہنچ جانے کا ارادہ ہے۔

کوئی چھینٹا پڑے اختر تو جوناگڑھ چلے جائیں
کرنجھڑی گانوں میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

ہمیشہ آپ کا مخلص
اختر

---

(۱۴)

... میاں اختر
موضع کرنجھڑی ۸ ارمئی ۵۶ء جوناگڑھ کاٹھیاواڑ۔

شفیق محترم السلام علیکم

میں ۴ مئی سے اپنی گاؤں پر آم کھانے اور گرمیاں بسر کرنے آیا ہوں۔

---

[1] ... صاحب کا یہ مضمون "مصنف" بابت جولائی ۵۶ء کے ۱۲ صفحات میں شائع ہوا۔

سارا کنبہ ہمراہ ہے، جون کے پہلے ہفتہ تک یہاں قیام رہے گا۔ یہیں سے آپ کو
۲ر مئی کو خط اور مضمون روانہ کئے تھے، جن میں سے صرف مضمون آپ کو پہنچا ہے۔ امید
ہے ایک آدھ روز دیر سے خط بھی مل گیا ہوگا۔ محبت نامہ مورخہ ۱۱ر آج شام کو مجھے
ہوا۔ یہ ۱۵ر اکتوبر کو جوناگڑھ پہنچا۔ آدمی اس ہفتہ کی ڈاک لینے گیا تو مکتوب فرحت اسلوب بھی لایا۔
بڑی دیر تک میں اس کے مطالعے سے محظوظ ہوتا رہا۔ میں نے مضمون اور خط دونوں ڈاک
میں ڈالنے کے لئے (کہ یہاں ڈاک کا کوئی انتظام نہیں ہے سوائے جوناگڑھ کے جو
یہاں سے تیرہ [۱۳] میل کی مسافت پر ہے) گھر پر بھیج دیئے تھے۔ تعجب ہے کہ
آپ کو مضمون کے ہمراہ میرا خط نہیں ملا۔ جو مصنف کے تبصرہ پر مشتمل تھا۔ براہ
کرم جلد مطلع فرمائیں کہ وہ خط آپ کو ملا ہے یا نہیں۔

حیات ولی، ویسے تو مدت ہوئی لکھ چکا ہوں۔ لیکن ابھی اس میں کئی اضافے
کرنے باقی ہیں جن کے لیے میں وقت نہیں نکال سکا۔ میرے نجی مشاغل نے
اس کام میں اس قدر روڑے اٹکائے ہیں کہ میں اس کام کو جلد انجام نہیں دے سکا۔
بہرحال یہاں سے گھر پہنچتے ہی اس کی تکمیل کروں گا اور آپ کو بھیج دوں گا۔ برسات کے دنوں میں
شاید فرصت مل جائے اور یہ کام پورا ہو (آپ مطمئن رہیں میں دلی پر برابر کام کر رہا ہوں اور
انشاءاللہ اس کی تکمیل کرکے چھوڑوں گا۔ واللہ بیداللہ تعالیٰ۔

آپ جوناگڑھ ضرور تشریف لائیے۔ لیکن برسات کا زمانہ بالکل قریب
آگیا ہے۔ اگر موسم کا لطف اٹھانا اور "بہار عمر" (یعنی دوستوں سے ملاقات کا

---

[۱] مقالہ حیات ولی مصنف کو طباعت کے لئے موصول نہ ہو سکا۔

آئیے۔ اور اگر "آسیر کیفی وچندہ" ہو کر آنا چاہتے ہیں تو اس کو جاڑوں کے آغاز
تک ملتوی کر دیجئے۔ پہلے کچھ مراسلت کا سلسلہ جاری کرائیے اور پھر نومبر یا دسمبر تک
آئیے۔ اس وقت نہ تو نواب صاحب ہی جوناگڑھ میں ہیں نہ دیوان صاحب،
لوگ اطراف میں ساحلی مقامات پر گرمیاں بسر کرنے چلے گئے ہیں [۱]۔

سنا ہے راجستھانی آگئے، اور اب کی مرتبہ اکیلے نہیں آئے۔ بلکہ "نصف بہتر" کو
ساتھ لے کر: شاید یہ خیال ہو کہ۔ ؎

تمھیں نے درد دیا ہے تمھیں دوا دینا!

ہوئے ان کا خط آیا تھا۔ میں ۲۰ کو ایک دن کے لئے جوناگڑھ اپنی کار پہ
جاؤں گا۔ اس وقت ان سے ملاقات ہوگی۔ اور "درد و دوا" کی کیفیت بھی معلوم
ہو جائے گی [۲]۔

"غبار خاطر" کئی روز ہوئے مجھے یہاں مل گئی۔ کئی ماہ ہوئے ناشر کو
آرڈر دے چکا تھا GET UP تو البتہ خوش نما ہے۔ گو شاندار نہیں لیکن کاغذ

---

[۱] افسوس ہے کہ قاضی صاحب کی خدمت میں جوناگڑھ جانے کی حسرت ہی رہی۔

[۲] عبدالصمد خاں راجستھانی جے پوری۔ راجپوتانہ کے مشہور سانڈنی سوار
مولوی بہلول خاں دانا کے ہمشیرزادے ہیں۔ جے پور کالج سے بی۔ اے پاس کرکر
مولوی صاحب موصوف راجستھانی کو میرے پاس علی گڑھ لائے۔ دو سال میری
نگرانی رہے اور امتیاز کے ساتھ ایم اے کیا۔ اپنے ماموں صاحب کی طرح ریاست
کے مسلمانوں کی حمایت میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اور قید و بند کے شدائد سے
(باقی فٹ نوٹ کا اگلے صفحہ پر)

اور کتابت اوّل درجہ کی نہیں۔ بہر حال ہے قابلِ مطالعہ چیز۔ جس طرح شکسپ
اور بائرن کو شعر و ادب سے۔ بیکن اور کارلائل کو اخلاقیات سے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ ٢٢ کا)

دوچار ہوئے۔ اس کے بعد نواب بہادر یار جنگ مرحوم و مغفور کے سکریٹری ہو
اور اسٹیس مسلم لیگ کے کام میں انتھک کوشش کی۔ آخر میں خانگی حالات سے مجبو
ہوکر ریاست سے کنارہ کش ہوگئے۔ میرے پاس علی گڑھ آئے اور میں
ان کو سفارشی خط دے کر قاضی صاحب کی خدمت میں جوناگڑھ روانہ کر
قاضی صاحب نے ہز ہائی نس کی جوبلی کی تقریب کے سلسلے میں ریاست
تاریخ انگریزی میں لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کرادی۔

حسنِ اتفاق سے قاضی صاحب کے خطوط کی تلاش کے سلسلے میں مر
عبدالصمد راجستھانی کے چند خطوط بھی دستیاب ہوئے جن کے درج ذیل اقتبا
سے آں مرحوم کے احسانات پر روشنی پڑتی ہے۔

(الف)

ڈاک بنگلہ جوناگڑھ ٣ر اکتوبر ١٩٣٦ء

مخترم بھائی سلام و محبت۔

آپ کی توجہ نے مجھ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ آپ کا شکریہ کس طرح ا
کروں۔ قاضی صاحب ہمہ صفت موصوف ہیں۔ انھوں نے جس خلوص
میرے معاملات میں دلچسپی لی وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ امکانات
(باقی فٹ نوٹ ١٢ کا اگلے صفحہ پر)

برک و میکالے کو تاریخ و سیاسیات سے علیحدہ کردیا جائے تو یقین

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ ٢٢ کا)

امید افزا ہیں۔ میری تلاش کو آشیانہ مل گیا شاید خوابوں کی نئی دنیا بھی بہت
جلد قریب ہوجائے ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

میں کام میں لگ رہا ہوں۔ خاکہ تیار کر رہا ہوں جس کی تعمیر آپ کی توقعات کو
مایوس نہ ہونے دیگی۔ انشاءاللہ! میں آپ کی توجہ کا ہمیشہ مستحق رہوں گا۔

آپ کا مخلص بھائی
عبدالصمد خاں راجستھانی

(ب)

ایوانِ اوس جوناگڑھ۔ ٢٥ر نومبر ١٩٣٦ء

مجتبی و مکرمی

سلام و نیاز۔ امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔ اور اجلاس (کانفرنس) کے کاموں
میں زیادہ مشغول۔ یہاں بھی آج کل (جوبلی کی) بہت دھوم دھام ہے۔ میں نے
تاریخ کے کام کے تین حصے ختم کر دیئے ہیں۔ ایک حصہ اور ہے اور وہ بھی چند روز
میں ختم ہو جائے گا! خدا کرے میری کوشش آپ کی خوشی اور قاضی صاحب کی سُرخ
روئی کا سبب بنے اور میرے مقصدِ حیات کے لئے منزل۔ آپ کا مخلص

عبدالصمد راجستھانی
(باقی فٹ نوٹ ١٢ کا اگلے صفحہ پر)

ہے کہ دوسرے موضوعات پر ان کی تحریریں اس قدر رفیع اور اہم نہ رہ سکیں۔

اسی طرح آزاد کی تحریر کا زور کچھ مذہب اور دینیات یا پھر سیاسیات کے دائرے ہی میں نظر آتا ہے۔ ادب میں ان کی قلم کاریاں طول کلام کے علاوہ اشعار

(بقیہ فٹ نوٹ ۱۱۱ کا)

ج

جوناگڈھ اسٹیٹ ۱۵ر جنوری ۱۹۴۷ء

پیارے بھائی الطاف صاحب

سلام و نیاز۔ میرا تقرر ڈائرکٹر آف انفارمیشن اور سکریٹری پبلک سروس کمیشن کے عہدہ پر ہوا ہے۔ یہ آپ ہی کی وجہ سے ہوا اس لئے آپ ہی کو مبارکباد پیش کر رہا ہوں۔ بعد میں تفصیلی خط لکھوں گا۔ قاضی صاحب سے کل ہی ملاقات ہوئی ہے۔ کئی ہفتوں سے بمبئی گئے ہوئے تھے۔ آپ کا بھائی۔ محمد

(فٹ نوٹ ۲ صفحہ ہذا)

۲ے (صفحہ) غبار خاطر: آنجہانی مولانا ابوالکلام آزاد مرکزی وزیر تعلیم بھارت کی مشہور و معروف کتاب جو احمد نگر کے زمانۂ نظربندی کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو موصوف نے نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کے نام تحریر فرمائے تھے۔ کتاب مذکور پر قاضی صاحب کی تنقید ان کی ... پر دال ہے۔ قاضی صاحب کی اسی تنقید سے متاثر ہو کر میں نے نواب صاحب کے خطوط بنام مولانا آزاد کو جمع کیا اور مولوی عبدالشاہد خاں شروانی سے اس پر مقدمہ لکھوا کر اس کا حق اشاعت مدینہ پریس کو دیا۔ آخرالذکر کتاب کا نام "کاروانِ خیال" میرا ہی تجویز کردہ تھا جس کی بابت قاضی صاحب مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ "غبار خاطر" سے بڑھ گیا۔ حضرت نواب صاحب قبلہ نے بھی اس نام کی بہت داد دی تھی۔

کی بھرمار کے لحاظ سے الشئی بالشئی یذکر کی مصداق ہیں۔ ان کے خطوط زیادہ تر اپنے ذاتی حالات و مشاہدات پر مشتمل ہیں جن کو ادبی چاشنی دینے میں تصنع سے کام لیا گیا ہے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ اظہر میاں کو سلام۔

مخلص

اختر

(۱۵)

پھولنا گڈھ..... جولائی ۱۹۴۶ء

"معارف" کا ہر نمبر آپ کے علمی و تاریخی ذوق کا آئینہ دار ہوتا ہے، اب کی مرتبہ بھی نواب سراج الدولہ (از مولوی رئیس الاسلام صاحب گوپاموی) نہایت محققانہ اور پُر از معلومات شائع ہوا ہے۔ مضمون کو پڑھتے وقت صفحہ ۱۹ کے فٹ نوٹ میں "منتخب اللغات" کا حوالہ دیکھ کر خیال ہوا کہ اس قسم کے لطائف اگر یکجا جمع کر دیئے جائیں تو کاتب صاحبان کو اپنی ستم ظریفیوں کا علم ہوتا رہے اور شاید ان کی اصلاح کا موجب ہو۔

تاریخی مضامین کے سلسلے میں آسامی مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ (مترجمہ اختر النساء بیگم صاحبہ بی۔ اے جبلپور) جتنی دلچسپ ہے، اتنی ہی مختصر ہے۔ چند ماہ ہوئے ایک بنگالی محقق بملاچرن لا کا ایک مفصل مضمون "سلاطین گور" پر نظر سے گزرا تھا۔ ابتدائی عہد میں اسلام کے ایک مایۂ ناز فرزند قاضی محمد رکن الدین سمرقندی (م ۶۱۵ھ بعہد سلطان علی مردان) المعروف بالعمید سرزمین کامروپ میں پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ ان کی ایک عربی کتاب "المراۃ المعانی فی ادراک العالم الانسانی" (جو یوگ پر سنسکرت کی ایک کتاب "امرت کنڈ" کا ترجمہ ہے) کے دیباچے میں کامروپ کی جامع مسجد میں ایک ہندو یوگی بھوجر برہمن کے اسلام اور قاضی صاحب کے ہاتھ پر اسلام لانے کا واقعہ ملتا ہے۔ اس ابتدائی عہد

میں آسام میں مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق اگر مزید تحقیقات کی جائے گی تو اُمید ہے کہ زیادہ حالات مل سکیں گے۔

اب کی مرتبہ جدید مطبوعات پر تبصرے خوب ہیں اُردو کے چوٹی کے رسائل میں بھی (رسالۂ اُردو کے سوا) اس سے زیادہ مفصّل اور بہتر تبصرے نہیں نظر آتے۔ تبصرہ نگار (سیدہ انیس فاطمہ بریلوی) قابلِ مبارک باد ہیں۔ حق

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل

وؔلی کے سلسلے میں کئی چیزیں پیش نظر ہیں، جن کی تکمیل فرصت چاہتی ہے۔ بعض فاضل دوستوں کی رائے ہے کہ اس کو کتابی صورت میں چھپوایا جائے۔ اب تک جو کچھ لکھا جاچکا ہے وہ ایک مضمون کی صورت میں ہے جس کے کئی گوشے تشنۂ تکمیل ہیں اور مکمّل ہونے کے بعد وہ مضمون کی حدود سے متجاوز ہو جائے گا اس لئے اس کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔ آپ کو جو مضمون بھیجا گیا ہے وہ پچھلے مقالے کی آخری کڑی ہے[1]۔

رفیتم یاراں تخفیف تصدیع
گر درد سر بود از ما شمارا

ہمیشہ آپ کا
اختر

---

[1] وؔلی گجراتی استدراک مع مصنف جلد ۳۷ ص ۱۶ و ۱۷ بابت اکتوبر ۱۹۵۵ء موجودرا... میں شائع ہوا۔

(۱۶)

...گڑھ ۳۰ جولائی ۱۹۵۶ء

شفیق محترم و صدیق مکرم دام عنایتکم۔

السلام علیکم۔ مودّت نامہ مورخہ ۲۲ ریہاں ۲۵ر کو ایسے وقت میں پہنچا کہ میں اور ... گھر کے لوگ خون کے آنسو رو رہے تھے۔ حادثۂ فاجعہ کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) میرے برادر نسبتی (میاں فصیح الدین کے بڑے بھائی) اور میری بیوی کے ... عزیز عمر ۴۴ سال، دیہات میں جہاں وہ شکار کے لئے گئے ہوئے تھے، ندی ... اپنے دوستوں کے ساتھ ایک چٹان کے نیچے بارش سے پناہ لینے کے لئے بیٹھے ... کہ وہ چٹان ان سب پر گری۔ ان میں سے تین بچ گئے اور دو دب کر ... ہو گئے۔ ان ہی میں ایک برادر عزیز فقیہ الدین (عرف حسین میاں) بھی تھے۔ ... کو بذریعہ ریل کار لایا گیا اور ساٹھ سالہ بوڑھے باپ نے پردیس میں اپنے ... کو سپرد خاک کیا۔ یہ حادثہ ۲۴ جولائی کو رونما ہوا۔ مرحوم نے ایک نوجوان ... دو بچے (لڑکی اور لڑکا) چھوڑے ہیں۔

(۲) عین اسی وقت کہ مرحوم کو پیوندِ خاک کیا جارہا تھا اطلاع ملی کہ میری بیوی ... بڑے بھائی قاضی عبدالحق صاحب، جو اپنے گاؤں سے اسٹیشن پر پیدل آرہے تھے ... ہی میں حرکتِ قلب بند ہوجانے سے رحلت فرما گئے۔ چنانچہ اسی وقت دوسری ... کا انتظام کرایا گیا اور میت کو اسی جگہ لاکر دفنایا گیا۔ مرحوم میرے چچازاد بھائی اور ... جاگیر کے سہیم و شریک تھے۔ اور اس زمانہ میں میرے دست بازو بلکہ پشت و پناہ ... ان دو عزیزوں کا یکا یک اُٹھ جانا اور اس طرح دردناک طور پر ان کی موت کا

واقع ہونا میرے لئے اور میرے خاندان اور گھر والوں کے لئے قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

آج سات دن ہوئے طبیعت ان پے در پے صدموں سے بہت نڈھال ہو رہی ہے اور انتشارِ دماغ و اختلاجِ قلب نے مجھے بھی آپ ہی کی حالت لا کر رکھ دیا ہے۔ ؎ "تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل"

میاں[1] فصیح الدین کا خط آیا تھا، انھوں نے لکھا ہے کہ ہاسٹل میں ان کا داخلہ نہیں ہو سکا اور نہ کالج میں، حالانکہ ریاست نے ان کو نامزد کر کے بھیجا ہے اور باقاعدہ تحریر لکھ کر ساتھ دی ہے۔ پھر بھی یہ مطالبہ ہو رہا ہے کہ ایک فارم پر افسر تعلیمات اور یہاں کے کالج کے پرنسپل کی تصدیق ہونی چاہئے۔ آپ اس معاملے میں جو بھی امداد کر سکتے ہوں وہ کیجئے۔ میں نے اُن کو ان کے بھائی کی وفات کی اطلاع نہیں دی ہے کہ شاید وہ گھبرا کر یہاں چلے آئیں۔ ابھی وہ اگست کے وسط میں یہاں آ رہے ہیں۔

اپنی خیریتِ مزاج سے مطلع فرماتے رہیں۔ میری حالت تو یہ ہے ؎

خارِ فراق دل میں ہے، سوزش جگر میں ہے
اب جایئے کدھر کہ خلش "دونوں گھر" میں ہے

---

[1] قاضی صاحب کی چھوٹی بیگم صاحبہ کے چھوٹے بھائی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کالج میں تعلیم حاصل کرنے آئے تھے۔

دُعا فرمایئے کہ خدا ہم لوگوں پر رحم فرمائے[1]

آپ کا

اخترؔ

(۱۷)

علی گڑھ۔ ۱۷ر ستمبر ۳۶ء

شفیق محترم زاد الطافکم۔ السلام علیکم

خیریت دارم و خواہم۔ آپ کے تینوں نوازش ناموں مورخہ ۳ر و ۱۹ر اگست اور

---

[1] اس خط (۱۶) کے بعد (یعنی ۵ر جولائی ۳۶ء سے) قاضی صاحب کی صبحِ زندگی کا خاتمہ اور "شامِ زندگی" کا آغاز ہوتا ہے۔
آئندہ خطوط میں آپ ان کی طبیعت کی موجودہ جودت اور جولانی کو بتدریج گھٹتا ہوا پائیں گے۔ اور اسی زمانے سے وہ اختلاجِ قلب کے مستقل مریض نظر آئیں گے۔
یہی حال راقم اور اس کی شریکِ حیات سیدہ انیس فاطمہ بریلوی کا ہوا۔ قاضی صاحب کے ہاں حادثے سے قریب ایک ماہ پہلے ۲۸ر جون ۳۶ء کو ہمارے سب سے بڑے لڑکے سید شاہد علی کا اچانک بعمر ۱۶ سال انتقال ہوا۔ میٹرک کا امتحان دے کر نینی تال سیر و تفریح کے لئے گیا ہوا تھا۔ وہیں اسے بخار ہوا اور چند گھنٹوں میں داغِ مفارقت دے گیا۔ بے حد ذہین، طبّاع، اولوالعزم۔ اچھا مقرر اور مضمون نگار تھا۔ اس وقت تک ایم اے کر چکا ہوتا۔ اور برسرِ کار رہ کر قوتِ بازو ہوتا۔ ؎
اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ہر ستمبر کا جواب جلد نہ دے سکا۔ گوناگوں مصروفیتیں، موجودہ خانگی حالات و افکار زیادہ تر اس تاخیر کا باعث ہیں۔

آپ کی ہر تحریر میرے لئے باعث تفریحِ دماغ و سکونِ قلب ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح آپ کی تعزیت نے اپنے مخصوص پیرائے میں میرے لئے بہت کچھ سکونِ خاطر کا سامان فراہم کیا لیکن آہ ہمارے آپ کے حادثے ایسے نہیں ہیں جن کو ہم کبھی بھول سکیں۔ آپ نے اپنے گھر کی حالت کا جو نقشہ پیش کیا ہے قریب قریب وہی حالت یہاں بھی ہے۔ اس غمِ جانگزا نے میری دونوں بیویوں کو صاحبِ فراش کر دیا ہے مرحومین کے گھر کے لوگوں کی حالت ان سے بھی ابتر ہے اس کا اثر میرے بچوں کی غور و پرداخت اور صحت، تعلیم و تربیت وغیرہ پر پڑ رہا ہے اور ان سب کے مجموعی اثرات نے میری صحت اور دماغی حالت کو معرضِ خطر میں ڈال رکھا ہے، عزیزہ سیدہ بہن کی حالت بہت قابلِ رحم ہے۔ اصلاحِ حال کی کوشش تو انسان جب کر سکتا ہے کہ وہ اپنے آپے میں ہو۔ حتی الامکان آپ بر ان کی دلجوئی فرض ہے اس آڑے وقت میں مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے تسلی و تشفی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہمارے گھر میں اس وقت بکثرت تلاوتِ قرآن نے تسکین بخش فضا پیدا کر دی ہے کہ اس میں ایصالِ ثواب کا بھی ایک بہت بڑا پہلو ہے۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ خدا کے ذکر سے دلوں کو راحت ہوتی ہے۔

میرے برادر نسبتی فصیح الدین غوثی انجینئرنگ کالج میں داخلہ کے لئے ۲۵ر ستمبر کو روانہ ہوں گے۔ پچھلی مرتبہ جب وہ گئے تھے تو

یہیں کے ایک طالب علم کے پاس ٹھہرے تھے مگر چونکہ اب وہ طالب علم تعلیم ختم کر کے واپس آ گئے ہیں اس لیے ان کے لئے داخلے سے قبل چند روز آپ ہی کو انتظام کرنا ہوگا۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ سیدھے آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوں۔

چند روز ہوئے ولی گجراتی پر ایک مضمون لکھ کر روانہ کر چکا ہوں امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ مصنف بابت ۱۵ کی نسبت آئندہ خط میں عرض کروں گا۔ میرے پاس مصنف نمبر ۱۴ میرے گھر کے سیانے بچوں نے اس قدر پڑھ ڈالا ہے کہ اب وہ مجھ سے نہیں پڑھا جاتا۔ براہِ کرم مہلا کی ایک اور کاپی جلد ارسال فرما دیں مصنف بابت جولائی ۱۹۳۱ کی ایک کاپی ذیل کے پتہ پر بھیج دیں۔

لہ چند سال قبل راقم اور عزیزی سید اطہر حسین رضوی بمبئی پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس سالانہ میں شرکت کر کے (جس کی صدارت جناب خان بہادر عبدالقادر محمد حسین صاحب دیوان جوناگڑھ نے کی تھی اور رسمِ افتتاح جناب نواب صاحب چھتاری صدر اعظم حیدر آباد نے ادا فرمائی تھی) قاضی صاحب کے ہمراہ ان کے دوست سیٹھ سلطان چنیل صاحب مرحوم کے مہمان ہوئے۔ ایک روز رات کو قریب بارہ بجے تک قاضی صاحب نے اپنے کلام بلاغت نظام سے ہم لوگوں کو مسرور و محظوظ فرمایا۔ عجب پرلطف صحبت تھی۔ جب پڑھتے پڑھتے تھک گئے تو کمرے کے ایک گوشہ سے آواز آئی کہ حضور! اجازت ہو تو کچھ میں بھی

سید منظور الحسن صاحب علوی عرف حسینی پیر صاحب۔

سید واڑہ، آسٹوریا گیٹ۔ احمد آباد

آپ ذرا رجسٹر دیکھ کر بتائیے کہ میرے نام مصنف کا سال کب ختم ہوتا ہے۔ تاکہ نذرانہ پیش کر دوں۔

اپنی اور متعلقین کی خیریت سے مطلع فرمائیں۔

ہمیشہ آپ کا۔ اختر

(۱۸)

فرنٹیر میل ۲۳ر مارچ ۱۹۴۷ء

محب محترم۔ السلام علیکم

مؤدت نامہ بمبئی میں مل گیا تھا۔ شکریہ۔ کل شام کو بمبئی سے دہلی [illegible]

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ کا حاشیہ)

عرض کروں یہ قاضی صاحب کے ایک ملازم خاص تھے۔ جو موصوف کی صحبت میں رہتے رہتے اچھے خاصے شاعر ہوگئے تھے۔ قاضی صاحب نے اس سخن گسترانہ [illegible] کا ایک فرمائشی قہقہہ سے خیر مقدم کیا اور فرمایا ہاں! ہاں! ضرور۔ ضرور۔ اس پر میں نے کہا کیوں نہ ہو؟ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں! میری اس پھبتی پر قاضی صاحب کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے اور پورے کمرے میں یہ عالم تھا کہ لوٹتے لوٹتے پھر رہے تھے۔ اوپر کے خط میں اسی [illegible] سپرد قلم کیا ہے۔

جانے کے لئے نکلا ہوں۔ چار روز دہلی میں مسٹر چندریگر کے پاس قیام رہے گا۔ ارادہ ہے کہ ایک دن کے لئے آپ سے بھی نیاز حاصل کر دوں۔ [illegible] فصیح الدین اب امتحانات سے فارغ ہو چکے ہوں گے۔ ان سے بھی کہہ دیں [illegible] آ رہا ہوں۔ میرے ہمراہ دو رفیقان سفر بھی ہوں گے۔ اگرچہ یہ [illegible] صرف "طائرانہ" ہوگی لیکن مجھے ۳۰ تک گھر پہنچنا ہے۔ اس لئے [illegible] کا لایُترک کُلّہٗ مالا یُدرک کُلّہٗ۔ غالباً بدھ کو علی گڑھ [illegible] نکل سکوں گا۔ امید کہ آپ مع اہل و عیال خیریت سے ہوں گے۔ [illegible] کو سلام۔

آپ کا

اختر

(۱۹)

[illegible] دسمبر ۱۹۴۷ء

صدیق مکرم۔ وعلیکم السلام

[illegible] کرم نامے لاجواب پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ ناسازی طبع۔ کچھ مصروفیات

[illegible] کو ہندوستان کی جو عبوری حکومت مرکز میں قائم ہوئی۔ اس میں [illegible] سے مسلم لیگ کے جن پانچ وزرا کا تقرر ہوا ان میں قاضی صاحب [illegible] مسٹر آئی۔ آئی۔ چندریگر بھی شامل تھے۔ موصوف کے ہمراہ قاضی صاحب بھی [illegible] مہمان ہوئے۔ واپسی میں ایک روز راقم الحروف کے پاس علی گڑھ میں قیام فرمایا۔ [illegible] ٹھاٹ اور شان و شوکت قابل دید تھی۔

اور کچھ غم دوستاں باعثِ تاخیرِ جواب ہیں۔ میرے محترم دوست حضرت نظام الدین [illegible]
قریشی صاحب مدیر اخبار "دین" احمد آباد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ایک
زبردست محبت کرنے والا۔ میری علمی کاوشوں کا مداح اور زندگی کے [illegible]
لمحات میں مجھے سنبھالنے والا اٹھ گیا۔ افسوس[1]!

"مصنف" مل چکا ہے۔ بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک پڑھ لیا ہے۔

مخلص۔ اختر

---

(۲۰)

کراچی ۸ر فروری ۱۹۵۹ء

محب محترم۔ السلام علیکم

آپ کا مکتوب گرامی کئی دن ہوئے مل چکا تھا۔ لیکن آئے دن کی [illegible]
اور مصروفیتوں میں جواب لکھنے سے قاصر رہا۔ قریشی صاحب[2] سے تین [illegible]
قیام گاہ پر جو تقریباً ڈیڑھ میل دور ہے مل چکا ہوں اور [illegible]

---

[1] مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ جناب قاضی صاحب کی تحریک پر [illegible]
کے متعدد مقالے گجراتی میں ترجمہ ہو کر اخبار "دین" میں شائع ہوئے۔ افسوس [illegible]
ملاقات سے محرومی رہی۔

[2] قاضی صاحب سخت بے سروسامانی میں جزیرہ "دیو" سے کراچی پہنچے [illegible]
سخت اور آسمان دور ہے۔ اور بقول ان کے "کل تک جو لوگ ان کی [illegible]
تھے اب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے ہیں۔" چونکہ قیام پاکستان [illegible]
علی گڑھ والوں کی بظاہر بہت رسائی اور قدر تھی اس لئے میں نے [illegible]
[illegible]

[illegible] سے ڈاکٹر ناظم صاحب[1] سے جو خرالذکر محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ڈائرکٹر ہیں اور
[illegible] بھی شناسا ہیں۔ ان کے ہاں کوئی مستقل جگہ نہیں ہے۔ اس لئے انھوں نے
[illegible] تین ماہ کے لئے کتبات پڑھنے کے سلسلے میں سو روپے کی ایک عارضی جگہ کے
[illegible] کہا۔ لیکن میں اس قدر ارزاں فروشی[2] کے لئے تیار نہ ہوا۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔

[illegible] (گزشتہ سے پیوستہ)

[illegible] علی گڑھ۔ خان بہادر پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب سے ملیں۔ میں نے قریشی صاحب کو
[illegible] صاحب کے بارے میں لکھ دیا تھا۔ لہٰذا اس خط میں موصوف سے ملاقاتوں کا ذکر فرما رہے
[illegible] قریشی صاحب چونکہ قدرے اطمینانی حالت میں علی گڑھ سے پاکستان تشریف لائے اس
[illegible] کراچی کا رنگ دیکھ کر اپنے وطن سرگودھا (پنجاب) تشریف لے گئے اور اب وہیں
[illegible] ہو کر یادِ خدا میں مصروف ہیں۔ افسوس ہے کہ اس کی زمانہ میں پاکستان نے ان کی محترم
[illegible] اور درویش وجود سے کوئی خدمت نہ لی کا نفرنس کا دیرینہ الغرض بہترین ہندو بیہ کتب اور کتبات کا ترجمہ آپ نے کروا [illegible]
[illegible] بڑا احسان ہے۔

[1] [illegible] ناظم صاحب: علی گڑھ کے نامور اولڈ بوائے سابق پروفیسر تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔ پاکستان میں
[illegible] آثار قدیمہ کے عہدے سے ریٹائر ہو کر کراچی یونیورسٹی کے انسپکٹر آف کالجز ہو گئے تھے۔ جون
[illegible] میں انتقال ہوا۔ عالم و محقق اور نمونے کے شریف و شائستہ انسان تھے۔

[2] [illegible] صاحب ریاست جوناگڈھ میں آنریری ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ رہ چکے تھے۔ میں نے اپنا اور
[illegible] دیکھا کہ موصوف دو دو اور تین تین سو روپے روزانہ احباب کی تواضع
[illegible] اور خرید کتب وغیرہ میں صرف کر دیتے تھے۔ یا اب یہ عالم ہے۔

کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی انشاء اللہ۔ ملاقات سے پہلے قریشی صاحب سے جو "حسنِ ظن" تھا وہ اب "عقیدت" میں تبدیل ہوگیا ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس! تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اس جہالت و ذلالت آباد میں ان کی موجودگی اور گاہے ماہے ان کی پُر لطف صحبت میرے لئے بسا غنیمت ہے، اگرچہ میں خود بھی ایک عرصہ سے علمی مشاغل سے بالکل دور ہونے کے باعث بالکل "کورا" ہوگیا ہوں۔

مکان ڈھونڈنے سے نہ ملا۔ پر نہ ملا حسین و جمیل بزخت و کرخت ہر قسم کے "مساعی" کر ڈالے مگر کامیابی نہ ہوئی آخر ایک بچپن کے ہم سبق لنگوٹیے یار ایک "متمول میمن تاجر" کی شکل میں مل گئے بڑی ہمدردی کی اور اپنے فلیٹ میں دو کمرے صرف ۱۲۰۰ کی "پگڑی" پر بطور "مفت کرم داشتن" دیدیئے ہیں۔ گزر ہو رہی ہے، ان کی ہمسائے گی بھی بہت مفید ثابت ہو رہی ہے۔ پگڑی کی رسم "مٹھائی" کے مترادف ہے۔ اور سندھ کا "پگڑ" بہت مشہور ہے۔ فی الحال ایسے کمروں کی "پگڑی" ڈھائی ہزار سے کم نہیں ہوتی۔ کرایہ الگ اور "الاٹمنٹ" کا خدشہ ہر وقت لگا ہوا!

آپ نے عباسی و کوثر صاحب کے پتے دریافت فرمائے تھے، یہاں آگئے ہیں۔ موخر الذکر میرے بھتیجے ہیں۔ ان دونوں کو کچھ لکھنا ہو تو میرے ہی پتہ پر تحریر فرمائیں میں ان کو پہنچا دوں گا۔

امید ہے مزاج شریف بخیر و عافیت ہوگا۔ حضرت قبلہ نواب صاحب

[illegible]ت میں آداب گھر میں اور بچوں کو دعا۔

یہاں چیف کنٹرولر آف ایکسپورٹ اینڈ امپورٹ کے محکمہ میں تین چار حضرات [illegible]ل کے اور علیگ ہیں ان کے نام یہ ہیں۔
کرامت اللہ۔ نصر اللہ۔ خلیل اور محسن اگر ان میں سے کسی کو جانتے ہوں اور [illegible] ش کر سکتے ہوں تو فوراً مطلع فرمائیے۔ ہمیشہ آپ کا۔

اختر

---

(۲۱)

[illegible] ۲۸ مارچ ۱۹۴۹ء

صدیق مکرم، السلام علیکم

[illegible] مدت سے آپ نے یاد نہیں فرمایا، خدا کرے کہ آپ مع متعلقین خیر و عافیت [illegible] ہوں۔ اور عرض یہ پچھلے دو ماہ سے دو بچوں کے ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو جانے سے [illegible] پریشان رہا۔ الحمد للہ کہ اب وہ دونوں بہتر ین صحت ہیں۔

[illegible] مکان کم از کم پڑ رہنے کو مل گیا ہے تلاشِ معاش کی سرگردانی ہنوز باقی [illegible] صاحب سے تین چار مرتبہ ملاقات ہوئی۔ ان کے ذریعہ سے ناظم صاحب [illegible] ملا۔ مگر یہاں صوبہ پرستی کا مرض اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ ایک دور افتادہ [illegible] کے لئے اپنا راستہ نکال لینا سخت دشوار امر ہے۔ بہرحال اب تک [illegible] میں کامیابی نہیں ہوئی۔ حلیم[1] صاحب سے ملنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

---

[1] [illegible] ابوبکر احمد حلیم صاحب، سابق پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
(باقی فٹ نوٹ ص ... پر ملاحظہ ہو)

یہاں کی زمین و آسمان سب بدلے ہوئے ہیں۔

مسٹر ایم۔ بی احمد یہاں مجلس دستور ساز کے ناظم ہیں۔ فی الحال ان کے ہاں ایک ریسرچ کا شعبہ (آئین اسلامی کے مطابق دستور سازی کے لئے) کھل رہا ہے۔ میں نے درخواست دی ہے۔ اگر آپ کے براہِ راست یا بالواسطہ مراسم ہوں اور آپ کو کوئی خاص تکلف نہ ہو تو میرے لئے سفارش بہم پہنچا دیں۔[۱]

مجھے معنّف کے ان پرچوں کی ضرورت ہے جن میں ولی سے متعلق مضا[illegible] شائع ہوئے ہیں۔ اگر آپ بھیج سکیں تو بڑا کرم ہوگا۔ حضرت نواب صاحب [illegible]

(بقیہ فٹ نوٹ صـــ کا)

سندھ اور کراچی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر [illegible] اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ راقم سے موصوف کا ۱۹۲۸ء [illegible] نہایت مخلصانہ سلوک رہا۔ جولائی ۵۵ء میں کراچی آ کر میں بھی بعض غلط فہمیوں کی بنا پر چار سال تک آں محترم کی بزرگانہ شفقتوں سے محروم رہا۔ بحمد اللہ اب [illegible] صورت نہیں ہے۔

[۱] مسٹر ایم بی احمد پاکستان بننے سے پہلے علی گڑھ میں ڈسٹرکٹ سیشن جج تھے آپ [illegible] تحریک و تشویق سے علیگڈھ ہسٹا ریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا [illegible] بصرفِ کثیر آپ کی ایک ضخیم کتاب کو طبع کرایا۔ چونکہ حضرت نواب صدر یار جنگ [illegible] مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی سے آپ کے خصوصی تعلقات تھے ان [illegible] موصوف کا سفارشی خط میں نے قاضی صاحب کے لئے بھجوایا۔

[illegible]ری طرف سے آداب عرض کریں۔

گھر میں اور بچوں کو میری طرف سے دعا۔

آپ کا مخلصِ واثق۔ اختر

---

(۲۲)

[illegible] اپریل ۴۹ء

محب مکرم، السلام

مکتوب نامہ مورخہ ۳ اپریل ۲ کو پہنچا اور مجھے کل شام کو دستیاب ہوا۔ [illegible] کی "کوتاہ قلمی" آپ کی دلی محبت اور خلوص کے منافی نہیں کہی جا سکتی۔ [illegible] بہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ "تضادِ خیال و عمل انتہائے خلوص کی بنا پر ہے" [illegible] کے اس خیال سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ آپ [illegible] خلوص و عملی ہمدردی کا امتحان ہو چکا ہے۔ میرے خیال میں تو آپ کے اس [illegible] کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت قبلہ نواب صاحب مدظلہ کی ہمدردی کا کس منہ سے شکریہ ادا [illegible] شاید ان سے میری "انتہائی عقیدت" کا یہ "خراج" ہے جو مجھے اس [illegible] میں مل رہا ہے۔ دلی دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ موصوف کو [illegible] سلوک کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ حضرت موصوف کے سفارشی [illegible] اگر براہِ راست پہنچتیں تو زیادہ مفید ثابت ہوتیں۔ اس لئے [illegible] ہمراشتہ ہٰذا ملفوف ہے تاکہ براہِ راست مسٹر ایم۔ بی احمد کو بھیج دی جائے

اس کے بعد ہی ان سے میرا ملنا مناسب ہے۔ ڈاکٹر معین الحق صاحب[1] کو بھی آپ ہی دو لفظ تحریر فرمادیں تو بہتر ہوگا۔

آج کل ایک تجربہ یہ بھی ہو رہا ہے کہ ہمارے مغربی تعلیم یافتہ بھائی [illegible] اکثر کچھ ایسے افرنجیت مآب اور اخلاقِ اسلامی بلکہ ہندی تک سے اس حد تک منحرف اور مستغنی ہو گئے ہیں کہ اچھے اچھوں کی رسائی ان تک نہیں ہونے پاتی اور اگر کسی سے ملتے ہیں تو اس قدر متکبرانہ اور احترازی انداز سے کہ پھر کسی کو دوبارہ ان کے پاس جانے کی ہمت اور ان سے ملنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

حضرت قریشی صاحب سے تقریباً ایک ماہ سے ملاقات نہیں ہوئی [illegible] ملنے گیا تھا معلوم ہوا کہ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ پھر ملنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے صدقِ مقال اور ایفائے عہد پر یقین محکم ہے اور میرے دل میں ان کی وقعت کچھ آپ سے کم نہیں ہے۔

باری[2] صاحب سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ واقعی بڑے دلچسپ آدمی [illegible]

---

[1] سابق پروفیسر تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی و ریسرچ آفیسر مجلس دستور ساز پاکستان کراچی [illegible] آپ پاکستان ہسٹاریکل ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری ہیں اور بفضلہٖ اپنے مشن [illegible]

[2] محمد عبدالباری (علیگ) مہاجرین کے مشہور و مخلص خدمت گزار۔ نہایت [illegible] کے اور دبنگ آدمی ہیں۔ قاضی صاحب جب میرے پاس علی گڑھ [illegible] تھے تو میں نے ملاقات کرائی تھی اس ملاقات میں باری صاحب کی جوشیلی اور [illegible] دلچسپ تقریر کو قاضی صاحب ہمیشہ یاد کیا کرتے تھے۔

لیکن میں جو یکسر تمام دلچسپیوں سے عرصے سے محروم ہو چکا ہوں شاید ہی ان کی صحبت سے محظوظ ہو سکوں۔

آپ سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے لیکن "زمین سخت اور آسمان دور" کا مضمون ہے۔ اس لئے سردست آپ کا "خیال" ہی کافی ہے جو اس بے کسی میں بھی برابر [illegible] جاتا ہے۔ بیگم اور بچوں کو دعا۔

آپ کا
اختر

---

(۲۳)

کراچی۔ ۱۳ راگست [illegible]

صدیق محترم، السلام علیکم

مودت نامہ موجب انبساط خاطر ہوا۔ مبارک باد کا شکریہ۔ مولوی صاحب قبلہ [illegible] (عبدالحق صاحب) کو دکھایا، وہ آپ کو "سر سید ثانی" کہتے ہیں "مادی و روحانی فوائد" [illegible] نے قہقہہ لگایا۔ "مادی فوائد" اس وقت "معرض بحث میں" ہیں۔ دیکھئے کیا [illegible] ہے۔ پانچ سو کا وعدہ تھا اور اب انھوں نے دو مہینے تین سو کے حساب [illegible] ہیں۔ چہ خورد بامداد الخ کا سوال درپیش ہے۔ اگر وعدہ پورا کریں تو بآسانی [illegible] ہو سکتی ہے[1]۔ صحت جواب دے رہی ہے، دو ماہ سے قلب کی شکایت ہے۔

---

[1] [illegible] قاضی صاحب کو روزگار مل گیا اور وہ کل پاکستان انجمن ترقی اردو کے اسسٹنٹ سکریٹری [illegible] اور اس خدمت کو بے مثل قابلیت کے ساتھ نومبر ۱۹۵۳ء تک انجام دیتے رہے (ملاحظہ ہو [illegible] مولوی عبدالحق صاحب مطبوعہ قومی زبان یکم اگست ۱۹۵۵ء)

جب ہر چیز "مقلوب" ہے تو اس انقلاب کی لپیٹ سے قلب کب تک غیر منقلب رہ سکتا ہے۔ ع "ہم بھی کیا یاد کریں گے"۔

"مصنف" کے دونوں پرچے مل گئے۔ بہت بہت شکریہ۔ اس کی جوانمرگی اور آپ کی۔ ہماری بے بسی کا نقشہ، آنکھوں میں پھر گیا۔ تاہم اس کی شش سالہ ادبی خدمات کسی بست سالہ اور چہل سالہ مجلات پر بھاری ہیں۔

مولوی صاحب آپ کو کچھ تکلیف دینا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ انھیں سید محمود مرحوم کے متعلق سر سید کے اس مضمون کی ضرورت ہے جو انھوں نے اول اول کی صفائی میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ بابت ۱۸۹۴ء کے آخر یا ۱۸۹۵ء کے شروع میں چھاپا تھا۔ اخبار کی فائلیں علی گڑھ میں موجود ہیں۔ اگر فرصت ہو تو خیر ورنہ کسی کو معاوضہ دے کر اس کی تلاش کرائیں اور مل جائے تو نقل کرا کر بھیج دیں۔ جسٹس محمود پر مولوی صاحب ایک مفصل مضمون لکھ رہے ہیں۔ اگر مطلوبہ مضمون مل جائے تو اس میں جان پڑ جائے۔ بہرحال اس کام کو آپ کے سوا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ براہِ کرم مسلم یونیورسٹی اور کانفرنس بک ڈپو کی فہرستیں بھجوائیے۔ انجمن کا کتب خانہ تیار ہو رہا ہے اس کے لئے بہت کتابوں کی ضرورت ہے۔ کیا عبد الحق بغدادی مرحوم کی کتابیں مل سکتی ہیں؟

اُمید ہے کہ آپ مع متعلقین، خیر و عافیت سے ہوں گے۔ گھر میں سلام دعائے خیر۔ بچوں کو دعا۔

مخلص

اختر

---

(۳۴)

کراچی۔ ۲۰ر اگست ۴۹ء

شفقی و مکرمی۔ السلام علیکم

مودت نامہ نے ممنون و مسرور فرمایا، کانفرنس کی مطبوعات کی فہرست بھی مل گئی۔ میرے لئے "یادِ ایام"[۱] مصنفہ مولوی عبد الحئی کی ایک جلد بھجوائیے۔ مولوی صاحب قبلہ نے فرمائش کی ہے کہ خطبات عالیہ[۲] ۳ جلد انجمن کے کتب خانہ کے لئے اگر ممکن ہو تو بلا قیمت بھیجی جائیں۔ ان کو بڑی مایوسی ہوئی کہ سنہ ۹۴ء و سنہ ۹۵ء کے گزٹ میں ان کا مطلوبہ مضمون نہ مل سکا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے ٹھیک یاد ہے کہ وہ مضمون انھیں سنین میں میرے سامنے لکھا گیا تھا اور چھپا تھا۔ بہرحال ان کا اصرار ہے کہ اس مضمون کی تلاش کی جائے۔ اس کے لئے آپ کو دوبارہ تکلیف دی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ ان سنین سے دو ایک سال قبل یا بعد کے کسی پرچہ میں یہ مضمون ہو۔ آپ ضرور کوشش فرمائیں۔

جلسہ شوریٰ کی کیفیت نہایت دل شکن ہے۔ مولانا نے آپ کا خط پڑھا اور اس روداد کو معلوم کر کے بہت افسوس کیا۔ شاید انہی دنوں کے متعلق حضرت [illegible] پیشین گوئی کی تھی۔ ع "ہنس کے بولا وہ شوخ رومن میں!"[۳]

۱۔ شائع کردہ ادارہ تصنیف و تالیف آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔

۲۔ ۱۸۸۶ء تا ۱۹۳۶ء کانفرنس کے خطبات صدارت کا مجموعہ۔

۳۔ [illegible] ۱۹۴۸ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام ہندوستان کے ممتاز مسلم اکابر کا

(باقی فٹ نوٹ ۳ اگلے صفحہ پر)

اس مہینہ کے وسط سے میرا تقرر بطور مددگار معتمد چار سو پر ہوا ہے اور پچھلے ڈھائی مہینوں کی تنخواہ بھی اسی حساب سے ادا کی گئی فالحمد للہ علی ذالک۔

؎ خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

رسالۂ اُردو کا غلط نامہ ملفوف ہے یہاں کتابوں کا قحط ہے۔ اس لئے یاد اور حافظہ سے جو کچھ لکھا جاتا ہے۔ اس میں غلطیوں کا رہ جانا ممکن ہے۔ میرے تبصرے میں بعض غلطیاں رہ گئی تھیں لاہور سے ہاشمی صاحب[1] نے بھی طباعت کی بعض غلطیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ غلط نامہ چھپوا دیا جائے۔

"معاشیات" اس ماہ سے جاری ہو گیا ہے ایک نسخہ ارسالِ خدمت ہے دو تین ماہ کے بعد سائنس نکل رہا ہے۔ انشاء اللہ دسمبر تک تاریخ و سیاست بھی نکلنے لگے گا۔ یہ سب رسائل میرے سپرد کئے گئے ہیں۔ کام بہت زیادہ رہتا ہے (دفتری) کام کی کثرت علمی کاموں میں حارج ہوتی ہے[2]۔

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ ۱۳۱ کا)

جلسۂ شوریٰ سلطان جہاں منزل علی گڑھ میں ہوا تھا۔ جس کی روداد میں نے "تعلیم کی ادارہ" کے عنوان سے مرتب کر کے ایک رسالہ کی شکل میں شائع کی تھی۔ ایک کاپی قاضی صاحب کو بھیجی جس کا موصوف ذکر فرما رہے ہیں۔

[1] مشہور مصنف مولانا سید ہاشمی فرید آبادی۔

[2] افسوس ہے کہ انجمن سے قاضی صاحب کے قطع تعلق کے بعد یہ سب رسالے ایک ایک کر کے بند ہو گئے۔

مجھے کانفرنس بک ڈپو کی فہرست کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کے ہاں کتابیں کی فروخت جاری ہو تو فہرست جلد بھجوائیے۔ مولوی عبدالحق بغدادی مرحوم کا عربی کتابوں کا ذخیرہ جو آپ کے ہاں پڑا ہوا ہے کیا اسے فروخت نہیں کیا جا سکتا؟ اگر اس کی فہرست تیار کرا کر بھیج سکیں اور اس کو نکالنے کا ارادہ ہو تو ہم انجمن کی طرف سے اس کو خرید لیں۔ بالاقساط بھیجی جا سکتی ہیں یا پھر بہ راہ بمبئی۔ اس مسئلہ کو سوچئے اور جواب دیجئے۔

قریشی صاحب مدت سے نہیں ملے چار ماہ پیشتر ان کے ہاں گیا تھا۔ مگر وہ لاہور سے باہر گئے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں آجکل کہاں ہیں۔ امید ہے آپ مع اہل و عیال بخیر و عافیت ہوں گے۔

گھر میں اور بچوں کو دعا۔

مخلص
اختر

---

(۲۵)

پاکستان انجمن ترقی اُردو اسپتال روڈ کراچی ۱ فون نمبر ۲۷۸۴۳۔
مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۵۲ء

برادر عزیز و گرامی۔ السلام علیکم

محبت نامہ مورخہ ۲۲ / کل صبح کی ڈاک سے پہنچا۔ احوال خیریت مآل

[illegible] حکیم محمد شریف الزمان صاحب مرحوم سے یہ فہرست تیار کرا کر روانہ کی۔ اسی [illegible] کہ حکیم صاحب کراچی آئے تو قاضی صاحب نے ان کا انجمن میں تقرر کرا دیا۔

سے مطلع[۱] ہوا۔ خدا کے فضل و کرم سے اب طبیعت بہتر بن صحت ہے۔ اگرچہ شکایت جاریہ بدستور ہے۔ کچھ عمر کا تقاضا ہے اور کچھ اس ماحول کا جس میں آج کل زندگی بسر ہو رہی ہے۔ خدا کرے میری زندگی سے آپ کی زندگی میں اضافہ ہوتا رہے لیکن میری زندگی تو آپ ہی ایسے محبان باصفا کی خوش و خرم زندگی کی محتاج ہے۔ اللہ تعالےٰ آپ کو اور مجھے بہترین زندگی عطا کرے۔

آپ کے مشاغل کا حال معلوم ہوا۔ امید ہے کہ دونوں سلسلے بخوبی چلتے رہیں[۲] گے۔ اس بات سے خوشی ہوئی کہ آپ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں

۱ـ بھارت کی مہربان گورنمنٹ نے خلاف ارادہ مجھ کو بھی ترک وطن کر کے براہ جنگل کراچی آنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں میں یکم جولائی ۵۰ء کو پہنچا اور قاضی صاحب کا "انجمن" میں مہمان ہوا۔ ع

"آملا پھر" سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

لیکن کچھ عرصہ قیام کے دوران میں لوگوں نے بتایا کہ کراچی میں نہ مال نہ مکان اور نہ روزگار۔ لہٰذا میں اندرون سندھ (ٹنڈو آدم ضلع نواب شاہ) میں آ گیا اور وہاں قریب ایک سال اپنی بربادی و خانہ ویرانی کی تکمیل کر کے دوبارہ کراچی آیا۔ یہ خط قاضی صاحب نے مجھے ٹنڈو آدم ہی ارسال فرمایا۔

۲ـ یہ دو سلسلے یعنی تصنیف و تالیف اور آٹا پیسنے کی چکی کے تھے۔ ع

"تھی"، مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

کراچی تشریف لا رہے ہیں اور زیادہ قیام کر سکیں گے، نواب زادہ صاحب میرے بھی پرانے شناسا ہیں[۱]۔

بچوں اور ان کی ماؤں کی طرف سے بیگم صاحبہ کو سلام و دعا بچوں کو پیار ساجد میاں[۲] کو میری طرف سے دعا۔

آپ کا مخلص

اختر

---

(۲۶)

یونیورسٹی آف سندھ - ڈیپارٹمنٹ آف مسلم ہسٹری حیدرآباد - (سندھ)

۲۲ر جولائی ۵۵ء

انشد ضروری۔

شفیق محترم سید صاحب زاد کرمۃ السلام علیکم

۱ـ نواب زادہ مرتضیٰ علی خان صاحب مرحوم آف بمبئی، پندرہ روز میں موصوف کا دارالم گرد ول روڈ جمشید کوارٹرز کراچی میں مہمان رہا اور اسی زمانہ میں الحاج میجر شمس الدین محمد صاحب سابق وزیر تعلیم بہاولپور (مقیم کراچی) سر حسن علی عبدالرحمٰن بیرسٹرایٹ لا اور مولوی سید ظفر حسین واسطی صاحب ایم اے ایڈووکیٹ کی گوناگوں امدادوں کی بدولت آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے اور میرے مستقل قیام کراچی کی صورتیں پیدا ہوئیں۔ اس کے علاوہ مجھ سے ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور نامہ و پیام کی چنداں ضرورت باقی نہ رہی۔

۲ـ اگرچہ وہ خود حیدرآباد (سندھ) کو سدھار گئے جہاں سے اس مجموعہ کے تین آخری خط آئے۔ اللہ کے بعد اب میرا بڑا لڑکا۔

میں ۱۹ر جولائی کو یہاں پہنچ گیا۔ آج کل کافی مصروفیت ہے۔ ۲۸ر کو وہاں آنے کا ارادہ ہے۔ عید کی چھٹیوں میں چند روز وہاں رہوں گا۔ برخوردار محمد اختر کو وہاں

لہ سندھ یونیورسٹی میں تعطیلات کلاں کے باعث ۱۸ر جولائی ۱۹۵۵ء تک قاضی صاحب کراچی میں اپنے بچوں کے ساتھ مقیم رہے۔ ۹، ۱۰، ۱۲ر اور ۱۶ر جولائی ۱۹۵۵ء کو میری ایچیز فرانکش پر کانفرنس اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوئے اور آپ کی فاضلانہ راہ نمائی میں تصنیف و تالیف کے ایک پنج سالہ منصوبہ کا خاکہ تیار ہوا۔ ۱۶ر جولائی کو ۵ بجے شام کا آخر الذکر جلسہ خصوصیت سے یادگار ہے۔ جس میں مولوی شمس الدین احمد صاحب سابق وزیر تعلیم بہاول پور و پریسیڈنٹ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے دولت کدہ جمشید کوارٹرس میں آپ نے ایک اعلیٰ درجہ کا مقالہ "سرسید کی علمی خدمات" کے عنوان پر پڑھا۔ قاضی صاحب کا راقم سے کافی عرصہ سے اصرار تھا کہ علی گڑھ والی مجلس مصنفین کے طرز پر ایک محفل علمی کا از سر نو آغاز کیا جائے۔ جس میں مختلف موضوعات پر مقالے پڑھے جائیں اور بعد نقد و تبصرہ ان کو "العلم" میں شائع کیا جایا کرے۔ مزید کرم یہ فرمایا کہ سب سے پہلے خود اپنے مندرجہ بالا مقالہ کی پیش کش فرمائی۔

اس تاریخی جلسہ میں میزبان محترم مولوی شمس الدین محمد صاحب کے علاوہ ڈاکٹر عبدالرحمان خاں صاحب۔ ڈاکٹر زبید احمد صاحب۔ ڈاکٹر مہدی حسین صاحب برلاس۔ پروفیسر رشید احمد ارشد صاحب۔ پروفیسر جلیل الرحمن اعظمی صاحب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی۔ جنرل اکبر خاں صاحب۔ پروفیسر حبیب اللہ غضنفر صاحب۔ پیر حسام الدین راشدی صاحب۔ آغا یعقوب دواشی۔ سید اظہر حسین رضوی صاحب۔ مولوی عظیم الدین (باقی فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

ساتھ لایا ہوں۔ وہاں ان کی پڑھنے کی طرف سے بے اعتنائی بڑھتی جارہی تھی۔ چونکہ وہاں کوئی نگرانی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے مناسب سمجھا کہ وہ یہیں تعلیم حاصل کریں۔ گورنمنٹ کالج میں داخلے کی اجازت اس شرط پر ملی ہے کہ چند روز میں سرٹیفکٹ مل جائے اور ضروری ہے کہ اس پر ایجوکیشنل انسپکٹر کے دستخط بھی ہوں۔ براہ کرم مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر صاحب (مسٹر سید ناصر حسین) سے مل کر سرٹیفکٹ دلوا دیں تو بڑا کام ہو جائے۔ محمد اختر ساتویں جماعت میں پاس ہو کر آٹھویں میں داخل ہوئے یہاں ان کو پانچویں درجہ میں داخل کیا جائے گا جو آٹھویں جماعت کے برابر ہے۔ سرٹیفکٹ کی فیس آپ دیدیں۔ میں وہاں آ کر آپ کو ادا کر دوں گا۔ ہیڈ ماسٹر کے نام درخواست

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ سے آگے)

... چوہدری صاحب۔ انعام عظیم ہمدنی صاحب اور خاکسار نے شرکت کی۔ قاضی ... کے بحر علم و فن سے مستفید ہوئے اور ان کی زیارت سے آخری بار مشرف ہونے کی ... کی اللہ! اللہ! کیسی پیاری صحبت تھی۔ اور کیسے اچھے لگ رہے تھے قاضی صاحب۔ ... حسب تحریر ۲۸ر جولائی تا یکم اگست کراچی پھر تشریف لائے۔ ۲ر اگست کی صبح کو حیدر آباد ... میں اپنے رفیق کار مسٹر انعام عظیم بی۔ اے۔ ایم۔ اے کے ہمراہ قاضی صاحب سے عید ملنے ... کی شام کو قریب مغرب حاضر ہوا۔ معلوم ہوا کہ قبرستان اپنی مرحوم چھوٹی بیگم کی قبر پر ... گئے تھے جہاں سے موٹر رکشا پر واپس آ کر یہیں کہیں کسی سے ملاقات کرنے چلے گئے ہیں۔ ... صاحب کی عالیہ قیام گاہ اودھا رام مینشن متصل کچہری ہاؤس بندر روڈ کی تیسری ... جس پر قلب کے مریض ہونے کے باعث چڑھنا اترنا میرے لئے بڑا دشوار ہوتا تھا ... ہی بیٹھ رہا۔ قریب ایک گھنٹہ انتظار کیا بالآخر مایوس اپنے مکان واپس چلا ... معلوم ہوتا ہے کہ ۲ر جولائی کو آخری ملاقات "قدرت" کی طرف سے جو فیصلہ ہو چکا تھا وہ اٹل اور ناقابل

ملفوف ہے۔ براہِ کرم اس میں حتی الامکان عجلت سے کام لیں تاکہ بچہ کا داخلہ
ہوجائے۔ امید ہے آپ معہ متعلقین خیریت سے ہوں گے۔ چونکہ صوبہ کراچی سے
سندھ میں تبدیلی ہوگی۔ اس لئے ایجوکیشنل انسپکٹر کا سرٹیفکٹ لازمی ہے۔ آپ
مقصود حسن خاں صاحب سے لے سکتے ہیں۔

آپ کا

اختر

(۲۷)

یونیورسٹی آف سندھ۔ ڈیپارٹمنٹ آف مسلم ہسٹری۔ حیدرآباد (سندھ)

۱۴ اگست ۵۵ء

برادر شفیق و محترم زاد کرمہٗ۔ السلام علیکم

سخت افسوس ہے کہ آپ گھر پر تشریف لائے اور میں موجود نہ تھا اس

لہ تعمیل فرمائش کی گئی۔ لیکن۔ ع

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

بچہ قاضی صاحب کے انتقال کے بعد پھر سندھ مدرسہ ہائی اسکول کراچی میں واپس آگیا۔
صاحب کی بڑی بیگم صاحبہ سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسری بیگم سے ابتداً لڑکیاں پیدا ہوئی
یہ پہلا لڑکا ہے۔ ماشاء اللہ بہت وجیہ و ذہین ہے۔ جب یہ پیدا ہوا تھا تو مجھے لکھا کہ میں نے اس
مرحوم بچے کے نام پر شاہد اختر رکھا ہے۔ میں نے بے تاب ہوکر جواب میں لکھا کہ ایسا ہرگز نہ
نامسعود ہے۔ قاضی صاحب نے میرے مشورے کو قبول کرتے ہوئے بچے کا دوبارہ نام محمد اختر رکھا
عمر دراز کرے۔ اور وہ اپنے اعلیٰ کردار و اخلاق سے اپنے نامور باپ کے نام کو دنیا میں روشن کرے

آپ کی ملاقات سے محروم رہا۔ انشاء اللہ آئندہ سنیچر کو حاضرِ خدمت ہوں گا۔
میں شام کو تین بجے پہنچوں گا۔ اور پانچ بجے تک حاضر ہو سکوں گا۔ تکلیف کے لئے
معافی چاہتا ہوں۔

آپ نے سرٹیفکٹ بھیجنے کی زحمت گوارہ فرمائی اس کا بے حد ممنون ہوں۔
لیکن آپ کی وہ زحمت اکارت گئی۔ افسوس ہے کہ وہ غائب ہوگیا اور تلاش کے باوجود
نہیں مل سکا۔ میں نے اپنے بیگ میں اسے رکھ لیا تھا۔ یہاں آکر دیکھتا ہوں
تو غائب۔ میں نے گھر پر بچوں کو لکھ دیا ہے کہ وہ تلاش کر کے بھیجدیں اور اگر
نہ ملے تو آپ کو اطلاع کریں۔ امید ہے آپ ضرور مزید زحمت گوارا
فرمائیں گے لہ

مقالہ تیار ہے لیکن اس کی ترتیب اور تہذیب ہو رہی ہے۔
حتی الامکان جلد حاضرِ خدمت کردوں گا ۲ہ

آپ سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ افسوس ۔

افسوس کہ دل ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی | ایک بھی ان سے ملاقات نہ ہونے پائی
اور ان کی صحبت باقی ۳ہ | آپ کا۔ اختر۔

لہ ... کے بجائے اسی تاریخ کو اور قریب قریب اسی وقت قاضی صاحب کی میت آئی۔
... کی علمی خدمات والے مقالہ کا ذکر کر رہے ہیں جو العلم میں شائع ہوتا۔
... کہ نہ زندہ رہے اور نہ صحبت باقی رہی ۔

... گلشن خرم بہار ے | دریغے ماند و فریادے و داد ے

(۳۸)

حیدرآباد (سندھ) ۵/اگست ۵۵ء

عزیز و محترم بھائی سید صاحب۔ السلام علیکم

کرم نامہ پہنچا ممنون فرمایا۔ سرٹیفکٹ یہاں کا غذات میں گم ہو گیا [illegible]
اتفاق سے مل گیا ہے اس لئے آپ دوسرے سرٹیفکٹ کی تجویز نہ کریں [illegible]
مجھے ANGINUS کا دورہ پڑ رہا ہے۔ آج شام تک اچھا ہو گیا [illegible]
انشاء اللہ کل شام تک حاضر ہو سکوں گا۔ امید ہے آپ مع [illegible]

ـــہ کانفرنس اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ کی سب کمیٹی کے جلسہ میں جو [illegible]
۵۵ء کی شام کو ۱/۲ ۵ بجے منعقد ہونے والا تھا اور جس میں شرکت کی [illegible]
خصوصی دی تھی۔

یہ بالکل آخری خط ۷ راگست کو قبل دوپہر ملا اور اس کے ایک گھنٹہ بعد [illegible]
پہنچی کہ قاضی صاحب اُسی روز صبح کو حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال [illegible]
اناللہ وانا الیہ راجعون۔

۱/۲ ۶ بجے شام حیدرآباد سندھ سے احاطہ انجمن ترقی اُردو کراچی میں [illegible]
لایا گیا ریڈیو کے ذریعہ اس حادثۂ جانکاہ کی خبر عام ہو چکی تھی۔ اس [illegible]
اعزہ اور ہم وطنوں کی ایک کثیر جماعت نے تجہیز و تکفین میں حصہ لیا۔ [illegible]
طول و عرض، بالخصوص کراچی و سندھ میں رنج و غم کی ایک لہر دوڑ گئی [illegible]
(باقی فٹ نوٹ آئندہ صفحہ پر)

[illegible] عافیت سے ہوں گے۔ بستر پر پڑے پڑے یہ خط آپ کو
[illegible]

آپ کا

اختر

(فٹ نوٹ صفحہ گزشتہ سے آگے)
[illegible] جلسے ہوئے اور اخبارات و رسائل نے تعزیتی شذرے لکھے۔
[illegible] قاضی صاحب کی ذات گرامی سے یہ اظہار محبت اُن کی زندگی میں کیا جاتا
[illegible] اس مظاہرۂ عقیدت کو آئندہ کچھ عملی استقلال بھی نصیب ہو جائے۔
[illegible] عام دستور تو یہ ہے کہ

ہزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگرانِ نخوردہ گزند راچہ خبر

مولانا ظفر علی خاں

(۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خاں کی وفات سال رواں کا المناک ترین حادثہ
اُنھوں نے کئی سال کی مسلسل علالت کے بعد چھیاسی سال کی عمر میں اپنے
آبائی وطن کرم آباد میں انتقال کیا۔ اور ان کے ساتھ ادب و سیاست کے ایک
پورے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ مولانا ایک جامع حیثیات شخصیت کے مالک
ان کا قلم ادب، شاعری اور صحافت کے میدانوں میں یکساں قدرت
کے ساتھ اپنی جولانیاں دکھاتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عرصۂ سیاست میں
اُن کی تگ و تاز ہماری تاریخِ تحریکِ آزادی کے ایک مستقل باب کی
حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا کے افکار و خیالات "زمیندار" کے کالموں
مدتوں گرم اور دہکتے ہوئے الفاظ کا جامہ پہن کر عوام اور بالخصوص
مسلمانوں کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بنتے رہے۔ انھوں نے بیسیوں
انجمنیں بنائیں اور توڑیں، بارہا انگریز کے اقتدار سے کھل کر ٹکر لی،
قید و بند کے مصائب میں مبتلا ہوئے لیکن قدرت نے انھیں جو

عزیمت ارزانی فرمایا تھا وہ جسمانی اذیتوں اور ذہنی پریشانیوں کے ہجوم
میں بھی لعلِ ناب کی طرح اپنی درخشانی دکھاتا رہا۔

ہماری بزمِ سیاست اب ظفر علی خاں کے دور کے رہنماؤں
سے قریب قریب خالی ہو چکی ہے اور پاکستان کی حد تک وہ اپنے
دور کی سیاست کے آخری نمائندے تھے جنھوں نے ۲۷ر نومبر
۱۹۵۶ء کی ٹھٹھرتی ہوئی شام کو لاہور کے ہنگاموں سے
دور کرم آباد کی پرسکون بستی میں خاموشی کے ساتھ اپنی جان
جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

مولانا ظفر علی خاں کا خیال آتا ہے تو ذہن میں گزشتہ
صدی کی پہلی چوتھائی صدی کے سارے سیاسی ہنگامے بیدار ہو جاتے ہیں۔
ترکِ تعاون اور خلافت کی تحریکوں میں ہم اس سیمابی شخصیت
کو پیش پیش پاتے ہیں، قادیانیت کا مسئلہ ہو یا مسجد شہید گنج
کا قضیہ، نیلی پوشوں کی تحریک ہو یا پنجاب کے یونینسٹوں کی
وزارت کا سوال، مولانا ظفر علی خاں ہر تنظیم کے ہراول دستے میں نظر آتے
ہیں۔ غرض ان کی مصروفیات کا دائرہ ہندو مسلم اتحاد، شدھی سنگھٹن، مسلم
لیگ، تنظیم مساجد اور خواجہ حسن نظامی سے لے کر جولاہوں کے حقوق
کا تحفظ اور مسلمانوں میں صنعت و تجارت کے ذوق کی تشویق و
ترغیب تک پھیلا ہوا تھا۔ مولانا کی فی البدیہہ شاعری اور چبھتے ہوئے
فقرے مخالفین سے بھی داد و تحسین وصول کر کے رہتے تھے۔

زودمعنی فقروں اور الفاظ کے تلازموں سے وہ بڑی سے بڑی بات
کہہ جاتے تھے جسے سن کر وہ بھی لطف اٹھاتے تھے جو ان کا ہدف
ہوتے تھے۔ ان کی شاعری میں ان کے عہد کی سیاست کی ساری
تفصیلات محفوظ ہیں، ان کے اخبار زمیندار کے فائل ان کی زندہ
یادگار ہیں۔ مولانا نے عمر طبعی کو پہنچ کر انتقال فرمایا ہے۔ ہمیں اور
آپ کو بھی ایک دن مرنا ہے۔ آئیے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر ان کی
مغفرت کے لئے دعا کریں۔

چودھری محمد اطہر

(۱۹۵۶ء)

بعض ہستیاں ملک و ملت کے لئے مایۂ ناز ہوتی ہیں لیکن اخباری و
اشتہاری شہرت نہ رکھنے کے باعث ان کے جینے اور مرنے کی کسی کو خبر نہیں
ہوتی۔ انھیں میں سے ایک چودھری محمد اطہر مارہروی تھے جن کا بروز جمعہ ۱۸
نومبر ۱۹۵۵ء آٹھ بجے شب بعمر ستر سال کراچی میں انتقال ہوگیا اور اس حادثہ کی
ہمیں بہت عرصہ بعد خبر ملی۔ مرحوم مارہرہ یو۔پی کے نامور لوگوں میں سے
تھے اور آپ نے علی گڑھ سے بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی کیا تھا۔ کامیاب وکیل اور
علمی و ادبی اعتبار سے ممتاز شخصیت کے مالک تھے تحریک خلافت و ترک موالات
[illegible] قید فرنگ سے بھی سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد ریاست بھوپال میں عرصہ تک
[illegible] لیجسلیٹو کونسل و مشیر قانونی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد جناب مرزا ممتاز حسن قزلباش
صاحب کی شرفا نوازی کی بدولت ان کے پرائیویٹ سکریٹری اور بعد ازاں خیرپور کے اسپیشل د[illegible]
[illegible] پر مقرر ہوئے۔ انصاف و دیانت اور دوست نوازی آپ کے کردار کی خصوصیات
[illegible] شاعر، ادیب اور بلند پایہ مصنف تھے۔ افسوس کہ مرحوم کے رشحات قلم منظر عام پر نہ
[illegible] ممکن ہے ان کے لائق صاحبزادے چودھری محمد انور اور صاحبزادی عزیزہ رابعہ
[illegible] اب اس طرف توجہ فرما کر ان کی معنوی یادگاروں کو دوام بخشیں۔

ڈاکٹر عبدالغفور بسمل

(۱۹۵۷ء)

لاڑکانہ سندھ

۲۶ رمئی ۱۹۵۵ء

محترمی - السلام علیکم -

انتظار بسیار اور تقاضائے کرم کے بعد "العلم" مل سکا ہے۔
حیرت ہے کہ آپ نے "یارانِ نجد" کو کس طرح بھلا دیا۔

"ملنے یارانِ وفا کا ہے بھلانا مشکل"

برادر مکرم جناب ڈاکٹر محمد ایوب صاحب (کوئٹہ) بھی آپ کے اسی تغافل کے مارے ہوئے ہیں۔

آپ نے "سندھ مدرستہ الاسلام کراچی" پر جو کچھ لکھا ہے وہ ایک شاہکار ہے جو ستنی ازدادہے "کولمبو پلان" (از سیدہ انیس فاطمہ بریلوی) پڑھنے کی چیز ہے۔ خوب لکھا ہے۔

عید کی مبارک باد کس طرح لکھوں۔ اس خیال سے طبیعت کچھ افسردہ سی ہو جاتی ہے۔

ع ہلال عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

نیاز کیش - عبدالغفور

یہ ہیں ڈاکٹر عبدالغفور بسمل جن کے اسی قسم کے شگفتہ و دل آویز خطوط اور بلند پایہ مقالات "مصنف" علی گڑھ اور "العلم" کراچی میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ اب سُنئے کہ ان کو کیا ہوا۔

کیپٹن ڈاکٹر محمد ایوب کا مکتوب

کوئٹہ - ۱۸ر جنوری ۱۹۵۷ء

سیادت و شرافت پناہ جناب سید الطاف علی صاحب دام مجدکم -
السلامُ علیکم - مزاج شریف -

برادرم ڈاکٹر عبدالغفور صاحب بسمل کے سانحے کی سخت اندوہناک اور دل ہلا دینے والی اطلاع آپ کو یقیناً اب تک مل چکی ہوگی۔ ۳۰ اور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۶ء کی درمیانی شب خاندان کے لئے ۱۹۳۵ء کے ہیبت ناک زلزلے سے کم افسردہ کن نہیں تھی۔ کوئی ۱۰ بجے شب کو لاڑکانے کا برقی پیغام موصول ہوا کہ ڈاکٹر عبدالغفور بسمل سخت بیمار ہیں۔ میری بڑی بہن (جو اس وقت اتفاق سے گھر میں موجود تھیں) اہلیہ اور میں لاڑکانہ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے اور بیماری کی نوعیت پر رائے زنی کر رہے تھے کہ ایک گھنٹہ بعد

دوسرا ایٹم بم، تار کی صورت میں نازل ہوا جس میں ان کے انتقال کی اطلاع تھی۔

مرحوم کی شخصیت کے چار پہلو تھے۔ بحیثیت انسان، شاعر اور ادیب۔ سیاست داں۔ اور طبیب اور ہر پہلو سے وہ منفرد تھے۔ انسان کی حیثیت سے پیلی بھیت اور لاڑکانہ ایک نسل تک ان کے لئے نوحہ خواں رہیں گے۔ لاڑکانہ کا بچہ بچہ انھیں یاد کرتا رہے گا۔ غریبوں کا مفت علاج۔ دوست واقربا نوازی اور حلیم الطبعی ان کی دیرینہ خصوصیتیں تھیں۔

ادیب کی حیثیت سے ان کی تصانیف اور "العلم" کے پہلے نمبران کے تبحر علمی۔ شوکت وسلاستِ بیان اور شیریں زبانی کے گواہ ہیں۔ میں تو جب بھی "العلم" کا پرچہ پہنچتا تھا تو سب سے پہلے اُن کا مضمون تلاش کرتا تھا اور اُن کا نہ ملنے سے جو مایوسی ہوتی تھی اس کا اظہار کئی مرتبہ ان کے نام نجی خطوط میں کیا۔

تقسیم ہند کے بعد "روداد قفس" تو آپ کے ذریعہ سے شائع ہو چکی ہے۔ "مہاجر کے آٹھ سال پاکستان میں" اس کا مسودہ انھوں نے دو سال ہوتے مجھے (جب میں لاڑکانہ گیا تھا) دیا تھا۔ میں نے اپنا "مقدمہ" تحریر کرکے تمام مسودہ انھیں واپس کر دیا تھا جو خوش قسمتی سے اب بھی ان کے کاغذات میں موجود ہے۔ مرحوم اس کی اشاعت کے خواہاں تھے۔ انشاءاللہ اس کی اشاعت کی طرف پوری توجہ کی جائے گی۔

ممکن ہے کہ ان کے کاغذات میں سے کوئی اور قیمتی ادبی دستاویز بھی مل جائے۔

سیاست داں کے لحاظ سے اپنے محدود حلقہ پیلی بھیت اور بریلی میں انھوں نے مسلم لیگ کے مقرر اور کارکن کی حیثیت سے بیش بہا خدمات انجام دیں اور اس جرم کی پاداش میں دونوں میاں بیوی نے ۶-۶ ماہ کی قید بھارت کی جیلوں میں بھگتی۔ افسوس ہے کہ پاکستان کے حقیقی معماروں کی خدمات کا کوئی ریکارڈ پاکستان کی مرکزی حکومت کے پاس نہیں ہے اس لئے اُن کی خدمات کی کوئی قدر نہ ہو سکی۔ مرحوم۔ ع

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا،

کے قائل تھے اور انھیں کسی سے کسی قسم کی شکایت نہ تھی، پھر بھی وہ ان لوگوں میں سے تھے جو بھارت کے غریب مسلمانوں اور رفقا کو چھوڑ کر پاکستان آنے پر آمادہ نہیں تھے مگر بھارت کے حکام نے انھیں جبر و تشدد سے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا، قید سے رہا ہونے کے بعد بھی ہر روز نئے شاخسانے کھڑے کئے جاتے تھے۔

مقامی حکام نے ان کی موجودگی ہی میں ان کا مطب اور دکان کسٹوڈین کو الاٹ کر دیا تھا اور کلکٹر پیلی بھیت نے انھیں بلا کر صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ پاکستان چلے جائیں۔ اس لئے اب انھیں صرف یہ ارمان باقی رہ گیا تھا کہ وہ پاکستان آنے کی بجائے اپنے وطن کی گلیوں میں وہاں کے ...انوں کے ساتھ ذلت کی زندگی بسر کرکے اور ٹھوکریں کھا کھا کر کیوں ... ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی ان کا رتبہ بہت بلند تھا۔ وہ مقامی میڈیکل ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے۔ تازہ طبی لٹریچر ہر وقت زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ پاکستان سے اب تک کوئی اعلیٰ درجہ کا طبی رسالہ شائع ہونا شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے انڈیا سے ترسیل منی آرڈر کی دقتوں کے باوجود خاص کوششوں سے "انڈیا میڈیکل گزٹ" اور دوسرے رسائل منگاتے تھے۔ ان کی تشخیص بڑے اعلیٰ پیمانہ کی تھی۔ مرتے دم تک بھی اپنے معالجین کو اپنے علاج کے متعلق ہدایات دیتے رہے۔ اپنی اہلیہ بیگم ڈاکٹر عبدالغفور کے لئے بھی وہ اس سلسلے میں بہترین مشیر کار تھے۔ ان کی عمر ابھی ساٹھ سال سے کم تھی۔ خون کے دباؤ کا عارضہ عرصہ سے تھا۔ اسی مرض کے سلسلے میں دردِ دل کا دورہ پڑا۔ شام تک مطب میں کام کرتے رہے۔ ۱۰ بجے شب سے طبیعت سست ہوئی۔ ۷ بجے تکلیف بڑھ گئی اور رات کو ۹ بجے بریلی اور پیلی بھیت کا یہ درخشندہ ستارہ لاڑکانہ میں چھپ گیا۔ آخر وقت تک ہوش و حواس بجا تھے۔ باتیں کرتے رہے۔ کلمہ وردِ زبان رہا۔ سورۂ یٰسین پڑھوا کر سنی اور پڑھنے والے کو بلند آواز سے پڑھنے کی تاکید کرتے رہے۔ ایک مجاہد کی زندگی جئے اور ایک شہید کی موت مرے۔ اللہ تعالیٰ انھیں دوسری دنیا میں صحیح مدارج عطا فرمائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لاڑکانہ سے میں کراچی بھی گیا تھا۔ سندھ مدرسہ میں آپ کے پرانے دفتر میں آپ کو تلاش کیا معلوم ہوا کہ دفتر ناظم آباد چلا گیا

ہے۔ تنہا کراچی کی سڑکیں اور محلے تلاش کرنے کی اب ہمت نہیں رہی۔ اس لئے ناظم آباد آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔

اگر مرحوم کے متعلق "العلم" میں کچھ شائع کرنا پسند فرمائیں تو میرے خط سے مدد لے سکتے ہیں۔

میں حال ہی میں کراچی سے لوٹا ہوں۔ "العلم" کا تازہ پرچہ مل چکا ہے۔ اب تک عدیم الفرصتی کے باعث اس کا مطالعہ نہیں کر سکا ہوں۔

دعاگو۔ ایوب

بیگم ڈاکٹر عبدالغفور کا خط

لاڑکانہ — ۱۴؍ فروری ۱۹۵۷ء

مخدومی و مکرمی جناب سید الطاف علی صاحب۔ السلام علیکم

۸؍ فروری کا تحریر کردہ نوازش نامہ مجھے موصول ہوا۔ آپ کے خلوص اور یاد فرمائی کی مشکور ہوں۔ رسمی تعزیت نامہ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ مجھے تو مرحوم کے (خدا جنت نصیب کرے) اظہارِ غم کے لئے بھی کوئی تسلی بخش لفظ دنیا کو دکھانے کے لئے نہیں ملتے۔ ابھی تک سکتہ اور بدحواسی کے عالم میں ہوں۔ آنکھیں اُن کے سامنے ہی کھو چکی ہوں۔ اب عقل و خرد۔ دل و دماغ اور ہوش و حواس سب کچھ صحیح معنوں میں گم کر چکی ہوں۔ بس ایک مرحوم کا خیالی تصور اور دائمی یادگار کی پرستش

میں یہ زندگی کا آخری دور گزار رہی ہوں۔ مرحوم تو نیکیوں اور نیک اعمالیوں کا مجسمہ ہی تھے، ان کی وفات بھی اس چیز کی شہادت دیتی ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ ان کی مقدس روح جنت الفردوس کے جھولوں میں جھولا جھول رہی ہوگی۔ لیکن مجھ بدنصیب گنہگار کا زندگی میں کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ بارگاہ ایزدی میں یہی التجا ہے کہ زندگی میں باقی ماندہ دور مرحوم کی یادگار تازہ کرنے میں گزر جائے۔ (آمین) اس سے پیشتر میں آپ کی خدمت میں دو خط عرشی صاحب سے بھجوا چکی ہوں اور بھائی محمد ایوب صاحب کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ عرشی صاحب کے خطوط آپ تک نہیں پہنچ سکے۔ پتہ غلط ہوگا۔ میں خود تو خط لکھ ہی نہیں سکتی ہوں ورنہ اب تک ان کے غم میں سینکڑوں صفحے کالے کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکال چکتی۔ اللہ بس باقی ہوس!

"روداد قفس" کے جتنے بھی نسخے آپ کے دفتر میں ہوں وہ سب مجھے بھیج دیجئے۔ "پاکستان کے چھ سال" نامی کتاب مرحوم نے لکھی ہے۔ اس کا مُبیّضہ بھی کر گئے ہیں اور زندگی ہی میں شائع بھی کرانا چاہتے تھے اور انھوں نے کبھی اس کا تذکرہ بھی شاید آپ سے کیا ہوگا۔ اس کتاب کو میں شائع کرانا چاہتی ہوں۔ براہِ مہربانی مجھے اس کے بارے میں تفصیل سے اطلاع دیجئے کہ اس کے شائع کرانے پر کتنا روپیہ اور کتنا وقت صرف ہوگا؟

میں ان کے حالات میں بھی ایک کتاب شایع کرانا چاہتی ہوں

اس میں آپ کی مدد کی بہت سخت ضرورت ہے جتنے مطبوعہ اور
مطبوعہ خطوط اور کلام آپ کے پاس ہیں وہ ازراہ کرم دستیاب
کے مجھے عنایت فرما دیجئے۔ ڈرگ روڈ میں ان کے ایک دوست گویا
ان آبادی پیلی بھیت کے رہنے والے ہیں، مرحوم کے کچھ نہ کچھ خطوط
کلام ان کے پاس ہوگا۔ ان کو خط لکھ کر آپ مجھ کو بھجوا دیجئے۔ ان کے
ات کی کتاب کے لئے بہت کچھ آپ کو لکھنا ہوگا اور اُسے ترتیب
کے طریقے بھی بتانے پڑیں گے۔ اگر کبھی قریب عرصہ میں سندھ
کسی دورہ پر آئیں تو کم از کم ایک روز کے لئے لاڑکانہ میں
م رنجہ فرما کر مرحوم کی آخری آرام گاہ کی زیارت کر جائیے۔
کے سب حالات بدستور ہیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔

خدا حافظ

بدنصیب غم زدہ بیگم عبد الغفور

مندرجۂ بالا غم ناموں اور ڈاکٹر بسمل کے سانحۂ ارتحال
اس درجہ تاثر ہے کہ کچھ اپنی طرف سے بھی لکھنے کا یارا
ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جونا گڈھی کے بعد یہ
سرا حادثہ ہے جس نے دل ہلا دیا۔ آخر میں ایک نوحہ
ظہ ہو۔

نوحہ

آج محفل سے اُٹھ گیا بسمل — اُٹھ گیا حیف ایک صاحبِ دل
مردِ آزاد مخزنِ آداب — جانِ اخلاق رونقِ محفل
شاہِ اقلیمِ فنِ شعر و ادب — محسنِ فن سخنورِ کامل
نازشِ ملک محسنِ ملت — مخلصِ قوم رہبرِ کامل

رہبرِ کاروانِ عشق گیا
اب نہ ہے قیس اور نہ ہے محمل

بابائے اردو

(۱۹۵۹ء)

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے جس کنووکیشن میں علامہ سید سلیمان ندوی صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی اور مولوی عبدالحق صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں اُس میں مَیں موجود تھا، جلسہ کے بعد لوگ بڑھ بڑھ کر مُبارک باد دینے لگے تو مولوی صاحب بجائے خوش ہونے اور شکریہ ادا کرنے کے ایک ایک کو ڈانٹنے لگے "کیا بکتے ہو! ان فضول باتوں میں کیا رکھا ہے، کام ہونا چاہئے۔ کام۔ ٹھوس کام" سب لوگ ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ مولوی صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔

۱۹۳۹ء جب ہندی اردو کا قضیہ شباب پر تھا مولوی صاحب ملک کا طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ علی گڈھ بھی آئے۔ یونین ہال میں آپ کے اعزاز میں جلسہ ہوا اردو کی حمایت میں مولوی صاحب نے ایک پُرمغز اور پُرجوش تقریر کی اور علی گڈھ والوں کو عملی کام کا پروگرام بتایا، تقریر کے آخر میں فرمایا: "آپ تقریر بازی چھوڑیئے، کام کیجئے۔"

مولوی صاحب کی تقریر کے بعد ایک رزولیوشن پر بولنے کے لئے میں

بھی طلب کیا گیا، میں نے اخلاقاً ضروری خیال کیا کہ اپنی تقریر کا آغاز مولوی صاحب
کی تعریف و توصیف سے کروں، چند ہی جملے بولنے پایا تھا کہ مولوی صاحب چیخ
اٹھے "یہ کیا لغویت ہے، کوئی کام کی بات کہہ سکتے ہو تو کہو ورنہ وقت ضائع
نہ کرو" سارا جلسہ ہنس پڑا، تالیاں بجنے لگیں اور میں نادم و شرمسار ڈائس
سے اتر آیا، رات بھر مارے کرب و بے چینی کے نیند نہ آئی صبح ہوئی تو دل کی
الجھن دور کرنے اور اپنی توہین کی تلافی کے لئے میں نے مولوی صاحب کو
ایک سخت شکایتی خط لکھا جس کا مولوی صاحب نے تو کوئی نوٹس نہ لیا البتہ
عقیدت مندوں میں کافی ہلچل مچ گئی، اس قضیہ نے کافی طول کھینچا اور [illegible]
تک میں نے مولوی صاحب کا بائیکاٹ کیا، نہ خط لکھا اور نہ ملاقات کی
ساتھ ہی یہ ارادہ کیا کہ ایسا اونچا کام کر کے دکھایا جائے کہ ایک دن
کو مولوی صاحب اور ان کی پارٹی بھی قائل ہو جائے، چنانچہ "مجلس
مصنفین علی گڑھ" قائم کی اور اپنی ادارت میں رسالہ "مصنف" جاری کیا
تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ "مصنف" کے متعلق مولوی صاحب کے تعریفی
خطوط آنے شروع ہو گئے اور میں بھی اظہار ادارت پر مجبور ہو گیا [illegible]
۱۹۴۳ء کے سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں [illegible]
کی صدارت کرنے مولوی صاحب علی گڑھ تشریف لائے اور آپ نے
اسٹریچی ہال میں بڑی دھوم دھام کا خطبہ دیا۔ اس زمانہ میں مولوی صاحب
ان تمام فدائیوں سے جنھوں نے یونیورسٹی کی جامع مسجد میں حلف نامہ پر
دستخط کئے تھے کہ آئندہ زندگی بھر اردو بولیں گے، اردو لکھیں گے اور

پڑھیں گے" ان کی بدعہدی کی وجہ سے سخت بدظن اور برہم ہو چکے تھے، لہذا
تقریر میں ان کو ایسا جی بھر کر ڈانٹا اور پھٹکارا کہ تہلکہ مچ گیا، جس وقت مولوی
صاحب کی یہ آتش بار تقریر ہو رہی تھی، میں بحیثیت منتظم جلسہ اتفاقاً کسی
ضرورت سے ڈائس پر گیا اور کرسی صدارت کے پاس سے گذرا، مولانا
ہاشمی فرید آبادی صاحب بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، مولوی صاحب
کی مجھ پر نظر پڑی تو میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور جلسہ کو مخاطب کر کے فرمایا "بس
ایک یہ شخص کام کرنے والا ہے، بہت اچھا کام کر رہا ہے"۔
ایک جلسے میں ڈانٹ ڈپٹ اور دوسرے میں دلنوازی، مولوی صاحب
کو کوئی کیا کہے، اور کیسے کہے۔!

اوائل ۱۹۳۴ء میں میری کتاب "حیاتِ حافظ رحمت خاں" شائع
ہوئی تمام مشہور اخبارات اور رسائل نے اس پر عمدہ عمدہ تبصرے لکھے۔
لیکن مولوی عبدالحق صاحب کے رسالہ "اردو" نے جو اس وقت اورنگ آباد
دکن سے شائع ہوتا تھا، نہایت کڑی تنقید کی، بات یہ تھی کہ کتاب میں
"حافظ شہید" کی کچھ کرامتیں درج کی گئی تھیں جو ایک تاریخ کی کتاب میں نہ ہونی
چاہئیں، لیکن اپنی اس غلطی کے اعتراف کے باوجود مجھے "تنقید" بہت
ناگوار گذری اور اس وقت سے مولوی صاحب اور ان کی انجمن کی ہر بات
بری لگنے لگی، حتیٰ کہ ۱۹۳۷ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کی پنجاہ سالہ
جوبلی کے موقع پر مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں مزاحاً لفظ "انگریز"

کے معنی "غیاث اللغات" کے حوالے جب یہ بیان کیے کہ۔

"یکے از جانورانِ آبی کہ بر ساحلِ سمندر می ماند"

تو میں نے اپنے مضمون "سیرِ لاہور" میں اس کو سنجیدہ رنگ دیدیا اور مولوی
صاحب کی لغت دانی کی حقیقت ظاہر کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔ اسی
میں پٹنہ میں "عبدالحق راجندر پرشاد پیکٹ" کے تاریخی اجتماعات ہوئے
مولوی صاحب کے جلسوں جلوسوں اور آؤ بھگت میں ایک بزرگ
آج کل موصوف کے نہایت بے باک ادبی ناقد ہیں) سب سے زیادہ پیش
پیش تھے۔ ایک مسئلہ پر بحث کے دوران مجھ سے اُلجھ پڑے، لیکن میرے
تعجب کی حد نہ رہی کہ مولوی صاحب نے بحیثیت صدر میرے حق میں
فیصلہ دیا اور اس کی بالکل پرواہ نہ کی کہ اُن صاحب کی شخصیت اس
جلسے کے لئے کس قدر کارآمد تھی اور اگر وہ چاہتے تو ناراض ہو کر مقاصد
کو بہت کچھ نقصان پہنچا سکتے تھے۔

میں اس واقعہ سے بکمال درجہ متاثر ہوا اور میں نے دل میں کہا، مولوی
بھی خوب ہیں، جب کاٹنے پر آتے ہیں تو دوست دشمن کو برابر کاٹ
ڈالتے ہیں۔

جب مولوی صاحب نے کل ہند انجمن ترقی اُردو کا صدر دفتر اور
دکن سے ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی نمبرا دریا گنج دہلی میں منتقل کیا
نے نئے عزائم اور تازہ جوش و ولولہ کے ساتھ اپنے کام کی تنظیم کی، ملک

علاقوں کے متعدد حلقہ جات قرار دے، ایک حلقہ میں علی گڈھ بھی
تھا، جس کے مرکزی دفتر کی رسم افتتاح کا جلسہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل
کانفرنس کی عمارت سلطان جہاں منزل کے ہال میں منعقد ہونا قرار پایا۔
مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیم ریاست حیدرآباد دکن صدر
سر راس مسعود مرحوم، ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم بہار اور نواب
یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے اکابر نے بھی شرکت
کی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے بحث علالت
رسم افتتاح جلسہ ادا کی۔ میں نے بحیثیت سرد فتر کانفرنس اپنے کو میزبان
کیا اور جلسہ کو کامیاب بنانے میں بے پناہ محنت کی، اختتام جلسہ پر
صاحب نے اپنی تقریر میں شرکائے جلسہ اور تمام کارکنوں کا تفصیلی
ادا کیا لیکن صرف مجھ غریب کو نظر انداز کر دیا، اور میرے بارے میں
حرف نہ کہا، جذباتِ جوانی اس فروگذاشت کی کب تاب لا سکتے تھے، میں
ہو گیا اور میرے غم و غصہ کی انتہا نہ رہی، دوسرے روز مولوی صاحب
حاضر ہوئی تو میں شکایت کرنے ہی والا تھا کہ اُنھوں نے کاندھے پر ہاتھ
فرمایا۔

"دیکھو جی سید! جس طرح تم نے جلسہ کو کامیاب بنایا اسی طرح ہم نے
ہے اُس کو تم کامیاب بنانا" میں نے عرض کیا: "جلسہ کے لیے
کچھ کیا ہوتا تو آپ اپنی آخری تقریر میں ضرور ذکر کرتے، اب میں
مرکز کے لیے کچھ نہیں کروں گا" اس پر مولوی صاحب نے زور کا

قہقہہ لگایا اور فرمایا۔

"بڑے بے وقوف ہو، دیکھو جن لوگوں کے مُنہ کو تعریف کا خون لگ گیا
کس قدر نالائق اور ناکارہ ہیں اگر تم بھی ایسا ہی بننا چاہتے ہو تو بھی میرا کہا
کسی تقریر میں تمہاری بھی تعریف کردوں گا"۔ وہ دن اور آج کا دن ہے
کبھی کسی جلسہ میں میری تعریف ہوتی ہے تو مولوی صاحب کا یہ
مجھے معاً یاد آجاتا ہے۔

تقسیم مُلک کے بعد مولوی عبدالحق صاحب کا ارادہ پاکستان آنے کا
کیونکہ ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں تو اُردو کو خود بخود فروغ ہوگا، کام
میدان ہندوستان ہے، جہاں مسلم ثقافت اور اسلامی علوم و فنون
کے لئے اُردو کی ترویج و اشاعت ازبس ضروری ہے۔ اسی خیال
جب دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو اُس وقت بھی ان کے پائے
میں لغزش نہ آئی اور اُنھوں نے طے کیا کہ انجمن کو زیادہ سے زیادہ
منتقل کردینا چاہئے، علی گڑھ ہی میں انجمن کی ۱۸۹۵ء میں بنا ڈالی گئی
اور وہیں اس بُرے وقت میں اُس کو واپس جانا چاہئے۔ چنانچہ مولوی
علی گڑھ تشریف لائے، مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی (نواب
صدر یار جنگ بہادر) کی کوٹھی "حبیب منزل" میں قیام ہوا۔ ایک دو
دوا دوش کے بعد اولڈ بوائز لاج کے میٹنگ ہال میں ایک جلسہ ہوا
کے وائس چانسلر صاحب صدر تھے۔ کوئی تیس چالیس منتخب اصحاب

کی جن میں سے قریب قریب ہر ایک سے مولوی صاحب کے گہرے اور قدیم روابط
اور حُسنِ ارادت و عقیدت کی طویل داستانیں وابستہ تھیں، اکثر ایسے تھے جو
مولوی صاحب کے مستقل اجارہ دار تھے اور ان کی عالم تاب روشنی سے اپنے
اپنے چراغ روشن کرنے کے لئے ان کے گرد ایسا گھیرا ڈالے رکھتے تھے کہ کیا
مجال جو کوئی دوسرا بے میل شخص صاحبِ فضل و کمال ہونے کے باوجود مولوی
صاحب کی صورت بھی دیکھ سکے۔

آج بھی لوگ ہندوستان میں اُردو اور بابائے اُردو کی ہوا اُکھڑ جانے
کے باعث ایسے دور دور اور بیگانہ بنے بیٹھے تھے کہ ان کو پہچاننا دشوار تھا،
انجمن کے مستقبل کے بارے میں بے مزہ اور مصنوعی تقریروں کے بعد بحث
کا رخ بڑی ہوشیاری سے کچھ اس طرف موڑ دیا گیا کہ "صاحب نئے حالات
میں انجمن ادبی کام کرے تو مضائقہ نہیں، لیکن تبلیغی اور اشاعتی
کام نہیں کرسکتی"۔

خودستائی معاف! اس موقع پر مجھ سے زیادہ ضبط نہ ہوسکا اور میں نے
اپنی تقریر میں عرض کیا کہ "ہماری شکست خوردگی اور پسپائی کی کچھ حدیں
متعین ہوجانی چاہئیں، انجمن علی گڑھ کی ہے، علی گڑھ میں واپس لائی
گئی ہے کیا ہم اس کو جگہ دینے سے انکار کرسکتے ہیں؟" اس پر صدر محترم
نے نہایت تلخ لہجہ میں فرمایا۔

"دیکھئے صاحب! صاف صاف سُن لیجئے، پاکستان بننے کے بعد اب آپ
اپنی انجمن اور اُردو کو وہیں لے جائیے یہاں کوئی کام نہیں ہوسکتا"۔

امیر الدین قدوائی صاحب نے بھی میری تائید میں پُر اثر تقریر فرمائی، لیکن وہ بے نتیجہ ثابت ہوئی اور جلسہ اسی فیصلہ کے ساتھ برخاست ہو گیا کہ "موجودہ حالات میں کچھ نہیں ہو سکتا" میں نے اس رات کو مولوی عبد الحق صاحب کو جس درجہ آزردہ خاطر، مغموم اور ملول دیکھا اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی نہ دیکھا تھا جلسہ کے دوسرے روز علی الصباح حبیب منزل سے بسلسلہ ہوا خوری پیدل چل کر میرے غریب خانہ پر تشریف لائے۔ مجھے تعجب ہو گیا۔ میں نے عرض کیا "مولوی صاحب آپ نے کیوں تکلیف فرمائی، مجھے یاد فرما لیا ہوتا، میں خود حاضر ہو جاتا" جواب میں فرمایا "ارے بھئی! تمھارے سوا اب میرا یہاں کون ہے، جس کے پاس جاؤں اسی لئے آیا ہوں"۔

اس کے بعد مولوی صاحب نے پاکستان تشریف لے جانے کا عزم بالجزم فرما لیا، دو ایک بار اور علی گڑھ آئے۔ مولانا ابو الکلام آزاد صاحب کے فارمولا کے تحت انجمن کی تنظیم نو کے سلسلہ میں کر دہ علی گڑھ منتقل ہو صرف ادبی کام کرے، چند بے ضرر اصحاب اُس کی کمیٹی میں ہوں اور قاضی عبد الغفار صاحب سکریٹری ہوں وغیرہ وغیرہ۔

پاکستان مولوی صاحب پہلے آئے اور میں بہت بعد اواخر ۱۹۵۰ء میں آیا۔ یہاں کی شاندار خدمات اور اُن کی ذات گرامی سے متعلق "المتے" نہ صرف میرے اور آپ کے مشاہدے میں ہیں بلکہ وہ ہماری

تاریخ کا ایک ورق بن چکے ہیں۔

میں مولوی صاحب کے نہ شیدائیوں میں ہوں اور نہ مخالفوں میں میری ناچیز رائے میں ان کی زندگی کے دو حصے ہیں، ایک، ناقابل فراموش علمی و ادبی کارناموں کا جس کی تفصیل لکھی جائے تو ع

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اور دوسرا ذاتی حیثیت سے لڑائی جھگڑوں کا، آخر الذکر حصہ کچھ عرصہ کے بعد نسیاً منسیاً ہو جائے گا، اور اوّل الذکر ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کا مصداق بنے گا۔

مولوی صاحب کی افتاد طبیعت ایک فوجی جنرل کی طرح سخت کوش اور سخت گیر ہے، اسی لئے اپنی جان پر بھی بے طرح جبر کرتے ہیں، مثلاً زندگی بھر بیوی بچوں کی مسرت سے محروم رہے۔ ذاتی مکان نہ بنایا، ایک وقت کھانا کھایا، کبھی دن میں آرام یا قیلولہ نہ کیا اور کام، کام، صرف کام ہی کو اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھی اور رفقائے کار بھی اتنا ہی کام کریں اور اسی قسم کی "وہابی زندگی" بسر کریں جو معذور رہے تو مولوی صاحب کی اُن سے لڑائی ہو گئی۔ لیکن ان سے لڑنے والوں سے مجھے ایک شکایت ہمیشہ رہی اور وہ یہ کہ مولوی صاحب تو ہمیشہ ایک ہی سے تھے، جب تک ان کے جسم و جان میں توانائی تھی اور ان کی کمان کھنچی ہوئی تھی، یہی مخالفین ان کی ہر اچھی بُری بات کو خوشی خوشی برداشت

کرتے تھے لیکن جب ان کو ہر طرف سے کمزوری نے گھیر لیا تو وہ ان پر چڑھ دوڑے، اپنا اپنا زور دکھاتے، جو اللہ معاف کرے۔ بڑی تکلیف دہ بات تھی ؎

بیا زوانِ توانا وقوت سر دست
خطاست پنجۂ مسکین ناتواں شکست

"بابائے اردو کا سرفراز نامہ"۔

مکرمی سید صاحب سلامت!

آپ کا عنایت نامہ پہنچ گیا تھا اور آپ کا رسالہ "العلم" بھی وصول ہوا، لیکن آج کل آشوب چشم کی وجہ سے میں لکھنے پڑھنے سے معذور ہوں اس لئے "العلم" کے مطالعہ سے محروم رہا، خط آنے کے بعد میں نے آپ کا مضمون پڑھوا کر سنا آپ نے جو واقعات اس میں لکھے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں آپ کے تاثرات کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس کا تعلق آپ کی ذات سے ہے، اس مضمون میں فسادات کے بعد میرے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے آنے کا ذکر بھی ہے، انجمن کی پنجاہ سالہ تاریخ میں میں نے ایک باب ہجرت کے عنوان سے لکھا ہے، اس میں اس واقعہ کا ذکر تفصیل سے درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی نظر سے وہ تحریر نہیں گزری، وہ سب واقعات میں یہاں نقل نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ بہت طویل ہیں، البتہ وہ چند سطریں ذیل میں لکھتا ہوں جن کا تعلق آپ سے ہے۔

"صرف الطاف علی صاحب اور امیر الدین قدوائی صاحب کا اصرار تھا کہ علی گڑھ میں آکر کام کیا جائے، اس اجتماع میں جو صاحب شریک تھے اُن کی گفتگو سے مجھ پر یہ اثر ہوا کہ یہ لوگ موجودہ حالات کی وجہ سے کچھ سہمے ہوئے سے ہیں اور کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے، یا صاف کچھ کہنا نہیں چاہتے"

(تاریخ پنجاہ سالہ انجمن ترقی اردو صفحہ ۱۹۲)

خیر طلب
(عبدالحق)

مولانا عبدالمجید سالک

(۱۹۵۹ء)

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

۲۸ ستمبر ۱۹۵۹ء کو صبح ہی صبح "ڈان" کراچی میں یہ اندوہناک خبر نظر سے گذری کہ ہمارے محترم و مخلص دوست اور ملک کے ممتاز ادیب و صحافی مولانا عبدالمجید سالک کا ۲۷ ستمبر کی سہ پہر کو حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ چہل قدمی کے لئے مکان سے چلنے ہی والے تھے کہ خاتمہ بالخیر ہوگیا۔ اُن کی صحت کافی عرصہ سے خراب تھی لیکن حال ہی میں اُن کی طبیعت روبہ اصلاح ہونے لگی تھی۔ چنانچہ ۲ ستمبر ۱۹۵۹ء کے اپنے مکتوب میں تحریر فرمایا۔

میری طبیعت اب پہلے سے بہت بہتر ہے۔ گو ابھی کامل صحت نہیں ہوئی۔ اور لکھنے پڑھنے کا کام بدستور بند ہے لاہور کے بہترین ڈاکٹر علاج کر رہے ہیں۔ اور یقین دلاتے ہیں کہ موسم کی تبدیلی کے بعد طبیعت بہتر ہو جائے گی۔

"واللہ اعلم بالصواب"

روبہ صحت ہونے کی اس خوشخبری کے ساتھ ہی سالک صاحب نے خلاف توقع اسی خط میں یہ رنج دہ اطلاع بھی دی تھی کہ "سال بھر کی بیکاری اور بیماری نے میری مالی حالت پر بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ اللہ رحم کرے"۔

افسوس ہے کہ ۱۳ ستمبر تک جب کہ اُنھوں نے ہمیں آخری خط تحریر فرمایا بلکہ غالباً حیاتِ مستعار کے آخری لمحات تک اُن کو نہ معلوم کس وجہ سے نہ تو پانچ سو روپئے ماہوار کا سرکاری وظیفہ مل سکا اور نہ اُن کی معرکۃ الآرا کتاب "ہندوستان میں مسلم ثقافت" پر یونیسکو کی طرف سے ۴۸۰ ڈالر کا انعام ہمدست ہو سکا۔ بہر حال اب وہ جسمانی اور مالی آلام سے نجات پا گئے اور فضلِ خداوندی سے اعلیٰ علیین میں اپنی عمر بھر کی شاندار خدماتِ ملّی کا صلہ وافر پا رہے ہوں گے لیکن اُن کے پسماندگان۔ اعزّا اور احباب ایک بے بدل ادیب اور مخلص ترین انسان کی عملی ہمدردیوں اور گوناگوں امداد سے محروم ہو گئے۔ کل ہی ایک عزیز دوست نواب حسین احمد خاں کا ہری پور ہزارہ سے خط آیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں۔

"رات ۸ بجے کے ریڈیو پر مولانا سالک کی وفات کی خبر سُن کر جو تکلیف ہوئی اس کا علم اللہ کو ہے۔ میر صاحب! آدمی تو دُنیا میں بے شمار ہیں اور رہیں گے مگر انسانوں کا قحط ہے۔ اتنی بڑی دُنیا میں اُنگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ اُن میں سے ایک کی کمی ہوگئی۔ بجز دُعا کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اللہ تعالےٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور آخرت میں بہترین جگہ

عطا فرمائے۔ افسوس ہے کہ اُن کے صاحبزادگان سے کوئی تعارف نہیں ہے ورنہ اُن سے مل کر دل کا بوجھ ہلکا کرتا۔ جس وقت آپ نے تعارف کرایا تھا اور جو وعدہ اُنھوں نے فرمایا تھا اُس وقتِ آخر تک نبھا گئے۔ مجھے آپ کے توسّل سے ایک ہی انسان ملا۔ اور وہ مولانا سالک تھے۔ مرحوم دورانِ علالت میں بھی میرے کام سے غافل نہ رہے۔ کام کچھ ٹھکانے پر آچلا تھا اور میں لاہور پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُن کے (مولانا سالکؔ کے) تشریف لے جانے کی اطلاع مل گئی۔ افسوس! میں اُن کا جانشین کہاں سے لاؤں۔ نتیجہ یہ ہے کہ میرا جو کام اُن کے ذریعہ انجام کو پہنچنے والا تھا وہ اپنی پُرانی جگہ واپس آگیا۔ بہرحال آخر میں یہی کہنا پڑتا ہے کہ مشیّت ایزدی میں کسی کو دخل نہیں ہے۔ اب آئندہ کے لئے کوئی انتظام فرمائیے۔ تاکہ کوئی اور صاحب اگر لاہور میں ہوں تو اُن سے تعارف ہو جائے۔ گو یقین کامل ہے کہ وہ مولانا جیسے نہیں ہو سکتے۔"

شدّتِ غم کی وجہ سے ایسے وقت میں کہ مولانا سالکؔ کے انتقال کو چند ہی روز گذرے ہیں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ان کی تعزیت کا حق ادا کر سکیں۔ فی الوقت ان سطور کو ہم سالک صاحب کے اُس مرثیہ پر ختم کرتے ہیں جو خود اُنھوں نے اپنے لئے لکھا تھا اور جس کو راقم کے غریب خانہ پر ۲ر ستمبر ۱۹۵۶ء کی شب کو اپنے دل آویز ترنم میں پڑھا تھا۔

......ہم نہیں ہوں گے

چراغ زندگی ہوگا فروزاں، ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں، ہم نہیں ہوں گے
...انو اب تمھارے ہاتھ میں تقدیرِ ملت ہے
تمھیں ہو گے فروغِ بزمِ امکاں، ہم نہیں ہوں گے
...ئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زلفِ جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں، ہم نہیں ہوں گے
...ے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پر چھٹکے گی افشاں، ہم نہیں ہوں گے
...منور تھا کبھی، تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں، ہم نہیں ہوں گے
...ے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں جب ہوں گی آساں، ہم نہیں ہوں گے
...ہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں، ہم نہیں ہوں گے
ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا
یہی سرخی بنے گی زیبِ عنواں "ہم نہیں ہوں گے"

محمد چاؤش

(۱۹۵۹ء)

عزیز دوست مسٹر احمد اے جعفر[1] کی دعوت پر بمبئی پریسیڈنسی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کا انتظام کرنے ۹ ستمبر ۱۹۴۲ء کو علی گڑھ سے روانگی ہوئی۔ سید اظہر حسین رضوی[2] بھی شریک سفر تھے۔ ۲۴ اور ۲۵ کو کانفرنس تھی جس کی صدارت خان بہادر عبدالقادر محمد حسین دیوان جوناگڑھ نے اور رسم افتتاح نواب صاحب چھتاری صدر اعظم ریاست حیدر آباد دکن نے ادا فرمائی۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر چند روز قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی کے ہمراہ بمبئی ٹھہرے۔ اس کے بعد اظہر میاں کی تحریک پر حیدر آباد دکن گئے۔ حیدر آباد کا یہ میرا آخری پھیرا تھا۔ پھر کبھی جانا نصیب نہ ہوا۔ حسب معمول محترم غلام سید معین الدین صاحب کا حمایت نگر میں مہمان ہوا۔

اس دفعہ حیدر آباد میں تمام سابقہ دلچسپیوں کی بساط الٹ چکی تھی۔

---

[1] مالک جعفر ٹیمبرس وکٹوریہ روڈ کراچی

[2] متعلم مسلم یونیورسٹی بعدہٗ ایم اے ایل ایل بی (علیگ) مالک و اڈیٹر روزنامہ ... و منزل حیدر آباد دکن۔

بہادر یار جنگ[1] اور نواب کمال یار جنگ مرحوم ہو چکے تھے اور ان کی مرجع خلائق پر رونق ڈیوڑھیوں پر ہُو کا عالم طاری تھا ایسے میں کیا دل لگتا۔ اظہر میاں کا اصرار ہوا کہ ان کے گھر اورنگ آباد چلا جائے۔ وہاں پہنچے تو شہر کو خلاف توقع بالکل بے رونق پایا۔ اظہر میاں کی باجی بیگم ظفر مہدی صاحبہ کی امیرانہ مہمان نوازی البتہ آج تک یاد ہے۔ کانفرنس کی تعلیمی خدمت گذاری کے سلسلے میں میں نے ملک کے طول و عرض میں بے تعداد سفر کئے اور چونکہ میں تاریخ کا بھی ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اس لئے جہاں گیا تاریخی آثار کو بالالتزام دیکھا۔ نواح اورنگ آباد کی تاریخی اہمیت مسلم تھی۔ ظفر مہدی صاحب[2] کی کار میں پن چکی نامی ملک عنبر کا قدیم نظام آب رسانی، رابعہ دورانی کا مقبرہ، چھ میل کے فاصلہ پر دولت آباد کا مشہور تاریخی قلعہ، باولی جھرہ نامی چشمہ۔ سنہرا محل جس میں تانا شاہ کو قید کیا گیا تھا۔ گنبد زمانے بازگشت اور اورنگ آباد سے آٹھ میل دور خلد آباد جہاں اورنگ زیب عالمگیر کا مزار ہے۔ حضرت شاہ زری زر بخش کی خانقاہ جس کے گرد و پیش چودہ سو (۱۴۰۰) اولیاء اللہ کے مزارات ہیں۔ جی بھر کے دیکھے۔ خلد آباد کے پہاڑوں کے دامن میں اورنگ آباد سے گیارہ میل شمال الورا کے مشہور غار ہیں جن کی تفصیلی سیر کی۔ انہیں کو دیکھ کر اجنتا کے غاروں کو دیکھنے کا بھی اشتیاق ہوا۔

---

[1] ۲۲ جون ۱۹۴۴ء کو نواب بہادر یار جنگ کا انتقال ہوا۔

[2] ... سول کنٹریکٹر کراچی۔

قیام اورنگ آباد کے تیسرے روز اظہر میاں اور ان کے بڑے بھائی
سید اصغر حسین رضوی[1] انسپکٹر پولس کی معیت میں محلہ شاہ گنج سے بعد [illegible]
بس پر سوار ہوئے اور اجنتا کے لئے ساٹھ میل کا سفر شروع ہوا۔ بس [illegible]
آرام دہ اور قدرتی مناظر راہ حد درجہ پُر کیف تھے۔ میں اور سادے کپڑوں
میں ملبوس اصغر بھائی یکسوئی کے خیال سے سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور
اظہر میاں جو ہر معاملہ میں پیش قدمی اور بالادستی کے قائل ہیں سب سے آگے
ڈرائیور کے پاس بیٹھے۔

ہماری بس فرّاٹے بھرتی بادِ بہاری بنی چلی جا رہی تھی۔ [illegible] کے بعد [illegible]
ہرسول، اور پھلمڑی کے اسٹاپ آئے جہاں شریفے (سیتا پھل) کیلا [illegible]
مونگ پھلی خریدی جن کو کھاتے کھلاتے اور مزے مزے کی گپ [illegible]
ہوئے آگے بڑھے جب "الندہ" کا اسٹاپ آیا تو ایک سیاہ فام وحشت ناک
شکل و صورت کا موٹا تازہ آدمی جو ننگے سر تھا اور مٹیالے رنگ کا [illegible]
تہبند پہنے ہوئے تھا بس میں داخل ہوا۔ شام کے چار بج چکے تھے [illegible]
چلی تو تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ اگلی سیٹ پر وہ خوفناک شخص [illegible]
کے پاس بیٹھا ہوا ہے اور ان دونوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو [illegible]
اس پر میں نے اصغر بھائی سے کہا "ذرا دیکھئے تو یہ لوگ کیوں [illegible]
ہیں؟" اصغر بھائی نے اُچک کر دیکھا تو ایک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے

[1] حال انسپکٹر پولس کراچی۔

اور بولے "یہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔ میں ابھی اظہر کو یہاں بلائے لاتا
ہوں۔"

اصغر بھائی عین اُس وقت اظہر میاں کے پاس پہنچے جبکہ وہ نو وارد
سے دست و گریباں ہونے ہی والے تھے اُنھوں نے جاتے ہی دونوں کو
للکارا "خبردار! کیا کرتے ہو؟"

اصغر بھائی کی آواز سن کر ایک طرف تو اظہر میاں نے اپنا ہاتھ روکا
اور دوسری جانب وہ ہیبت ناک آدمی ٹھٹھک کر بولا "اصغر صاحب!
آپ کہاں؟"

اصغر بھائی۔ ارے میاں محمد! یہ میرے چھوٹے بھائی اظہر ہیں۔

محمد۔ اجی! مجھے کیا معلوم تھا۔ پھر تو میں ان کا غلام ہوں۔۔۔
بھیا میری خطا معاف کر دو۔

اور یہ کہہ کر وہ اظہر میاں سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے
دریافت کیا "آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟" اصغر بھائی نے بتایا کہ اظہر
علی گڑھ میں پڑھتے ہیں اور (میری طرف اشارہ کر کے) اپنے ان بزرگ
دوست کو وہاں سے اجنتا کی سیر کرانے لائے ہیں۔

محمد۔ پھر تو آپ لوگ میرے مہمان ہوئے۔ میں ان کو اجنتا کی
سیر کراؤں گا۔

اصغر بھائی۔ نہیں! نہیں! اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔
ہم ساتھ ہوں اور یہ کہہ کر اظہر میاں کو پچھلی سیٹ پر میرے پاس لے آئے۔

اس عرصہ میں بس برابر چلتی رہی۔

اظہر میاں سے جھگڑے کی وجہ معلوم کی گئی تو انھوں نے بتایا کہ جب وہ شخص ان کے برابر آ کر بیٹھا تو شراب کے نشہ میں دھت تھا اور اُس کے منھ سے سخت بد بو آ رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا کہ ذرا ہٹ کر بیٹھو تو لال پیلی آنکھیں نکال کر لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اصغر بھائی نے بیچ بچاؤ کر دیا نہیں تو میں اس کا سارا نشہ ہرن کر دیتا۔"

اصغر بھائی: "جی آپ اُس کو جانتے نہیں ہیں۔ یہ محمد چاؤش بڑا خونخوار اور خونی آدمی ہے۔ نہ معلوم کتنے قتل کر چکا ہے۔ اس علاقہ کا بے تاج کا بادشاہ ہے۔ یہاں اعلیٰ حضرت نظام کی نہیں اس کی حکومت ہے۔ بڑے پیمانہ پر سود کا کاروبار ہے۔ دس بارہ باغ اور مکانات ہیں۔ بے حساب زمین ہے۔ جس کی آراضی چاہتا ہے زبردستی ہتھیا لیتا ہے۔"

میں نے اصغر بھائی سے دریافت کیا "پولس اور حکومت اس کو کیوں نہیں دباتی؟"

اصغر بھائی: "جی! ریاست کی اونچی سے اونچی شخصیت اس کی گروہ بندی۔ امارت اور ساتھ ہی خوشامد اور خاطر و تواضع سے مرعوب ہے۔ نیچے سے اوپر تک حکومت کے تمام کل پرزوں کو قابو میں رکھنے کے گُر اسے معلوم ہیں۔ مثلاً پولس سب انسپکٹر پر انسپکٹر، انسپکٹر پر سپرنٹنڈنٹ کی اور سپرنٹنڈنٹ پر حکومت کے سکریٹریوں

اور وزرا کی شۂ ڈلنے کا ماہر ہے۔ ساتھ ہی خوب کھلاتا اور ہر قسم کا عیش کراتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص نے ہر طرح کی بدمعاشی کی اُسے کھلی چھٹی دیدی ہے۔ اس کے پاس خفیہ اور علانیہ کافی بندوقیں اور پستول بھی ہیں۔"

اصغر بھائی کی زبانی محمد چاؤش کا تعارف ابھی یہیں تک پہنچا تھا اور ہماری منزلِ مقصود اجنٹا کے غاروں کا فاصلہ چار پانچ میل باقی تھا کہ اچانک محمد چاؤش اپنی سیٹ پر جوش میں کھڑا ہو گیا اور ڈرائیور کو زور سے ڈانٹ کر گاڑی کو رکوا لیا۔

یہ جگہ بس ٹھہرنے کی نہ تھی کیونکہ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ حدِ نگاہ تک پہاڑ ہی پہاڑ یا چٹیل میدان نظر آ رہے تھے۔ اپنے ہاتھوں میں چپل لئے تہبند سنبھالتا ہوا محمد چاؤش دھم سے زمین پر کودا اور تیز تیز قدموں سے بس کی پیچھے کی اُس کھڑکی کے پاس آیا۔ جہاں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آتے ہی بڑے ادب اور لجاجت سے بولا: "اصغر صاحب! آپ صاحبان میرے مہمان ہیں۔ بس اب یہاں اُتر جائیے۔" اصغر بھائی نے ہر چند ٹالا مگر ایک شنوائی نہ ہوئی اور ہم لوگوں کو مجبوراً باہر نکلنا پڑا۔ بس تو اپنی راہ چل دی اور ہم محمد چاؤش کے حوالہ ہو گئے۔ اور وہ چلا ہمیں لے کر شراب کے نشہ میں جھومتا۔ لڑکھڑاتا، بک بک کرتا ہوا۔ تھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ ایک چھوٹا سا تالاب آیا۔ اس کے آس پاس درختوں اور جھاڑیوں میں بہت سے پرند رات کو بسیرا لینے کی تیاری میں آ جا رہے تھے۔ ایک خوبصورت پرند ایک

شاخ پر بار بار آکر بیٹھتا تھا اور پھر اُڑجاتا تھا۔ اُسے خصوصیت سے میں نے اور میرے
ساتھیوں نے دیکھا۔ ہم دل ہی دل میں قدرت کی صناعی کی تعریف کر رہے
کہ محمد چاؤش نے تہبند کی انٹی میں ہاتھ ڈال کر اپنا پستول نکالا اور پرند کی
جانب شست لگا کر بولا۔ دیکھئے میرا نشانہ۔ میں اس کی آنکھ پھوڑ
دیتا ہوں۔ محمد چاؤش کے پاس پستول دیکھ کر میں۔ اظہر میاں حتی کہ
اصغر بھائی بھی گھبرا گئے۔ خیال ہوا کہ یہ اپنے ہوش میں ہے نہیں۔ خدا معلوم
کس بات پر بگڑ جائے اور ہمیں گولی کا نشانہ بنادے۔ اپنی جان کے خوف کے
ساتھ ہی ساتھ مجھے اس معصوم پرند پر بھی ترس آیا اور میں نے محمد چاؤش
کہا: "مت مار دے بے چارے کو۔ کیا فائدہ بے گناہ کی جان لینے سے۔" یہ بات
محمد چاؤش کو بہت ناگوار گذری ایک دم میری طرف پلٹ کر اور پستول
والا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا "اچھا تو پھر کیا تمھاری آنکھ پھوڑ دوں۔" اس
گستاخی اور دھمکی سے میں ششدر رہ گیا لیکن معاً اصغر بھائی میرے
اور اس کے بیچ میں آگئے اور اس کا دھیان بٹانے کے لئے اس سے پوچھنے
لگے: "ارے بھئی محمد یہ بتاؤ تم نے ہم لوگوں کو بس میں سے تو اُتروا لیا
اب پیدل کب تک چلواؤ گے۔"

محمد چاؤش۔ ارے صاحب! سواری کی کیا بات ہے۔ ابھی
حاضر کرتا ہوں۔ ذرا سڑک آجائے۔" کوئی میل بھر اور پیدل چلے
شام کے پانچ بج چکے تھے۔ درختوں اور پہاڑیوں کے سائے تیزی سے
لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ شام کے وقت یوں بھی حساس طبیعتوں پر

افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس پر مستزاد اس وقت کی بے بسی بلکہ گرفتاری۔
ایک ایک قدم سو سو من کا ہو گیا۔ خدا خدا کر کے اجنٹا جانے والی پختہ سڑک پر
پہنچے۔ وہاں کچھ دوسرے راہ گیر نظر آئے جن سے دل کو کسی قدر ڈھارس
بندھی۔ سو دو سو قدم اور چلے تھے کہ سامنے سے ایک بنڈی (چھوٹی بیل گاڑی)
آتی دکھائی دی جس پر ایک ادھیڑ عمر کا شخص اور پانچ چھ نوجوان بیٹھے ہوئے
تھے۔ محمد چاؤش بنڈی کو دیکھتے ہی ہمیں چھوڑ سڑک کے بیچ گوے پر اپنے
دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی اس کارروائی پر بنڈی اُس کے قریب
آکر رک گئی اور اُس نے چیخ چیخ کر اور پستول گھما گھما کر بنڈی کی سواریوں سے
کہا: "اُترو بے اُترو اس پر میرے مہمان بیٹھیں گے۔" میں نے اور اصغر
بھائی نے ہر چند کہا: "ارے بھئی ان لوگوں کو تکلیف نہ دو۔ یہ پردیسی سیاح
ہیں۔ ان کے ساتھ سامان بھی ہے۔ بیچارے کیسے جائیں گے۔" لیکن
محمد چاؤش نے ہماری روک تھام کی بالکل پروا نہ کی۔ بنڈی میں
بیٹھے ہوئے نوجوان کچھ بگڑنے لگے۔ تو جھپٹا بھوکے چیتے کی طرح اُن پر
اور دھکے دے دے کر انھیں بنڈی پر سے اُتار دیا۔ اور اُن کے
سامان کو ٹھوکریں مار مار کر سڑک پر پھینک دیا۔ اس کے بعد گاڑی پر بیٹھے
ہوئے بنڈی بان کے ایک لات ماری اور اُسے حکم دیا "گھما گاڑی کو۔"

بنڈی بان کی کیا مجال تھی جو عذر کرتا۔ مجبوراً مجبوراً مائی باپ
مائی باپ کہہ کر اس نے بنڈی کو لوٹایا اور ہم لوگ قلبی ناگواری کے ساتھ
اُس پر سوار ہو گئے۔

محمد چاؤش اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا جس کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ بیٹھنے
کے بجائے بنڈی بان کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ اور اُس کی پیٹھ پر گھٹنے کے ٹہوکے
دے کر اور غل مچا مچا کر جوش دلانے لگا کہ تیز چلاؤ۔ تیز چلاؤ۔ اور تیز دوڑاؤ۔
حال ناظر کی بے ہنگم چرخ چوں والی بنڈی ایک بیل کمزور اور دوسرا جاندار۔
بے انتہا ڈھلوان پہاڑی سڑک کی چڑھائی۔ دونوں جانب گہرے کھڈ۔
منٹ منٹ پر بیل کاواسکاٹنے لگے۔ ہر لمحہ معلوم ہوا کہ اب گرے اب گرے۔
میں ہولِ دل اور ریاحی مرض کا پرانا مریض۔ قلب و دماغ بے کار ہو گئے۔
ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ آخر جب قوت مدافعت بالکل جواب
دینے لگی تو میں چلایا کہ "روکو۔ روکو گاڑی کو۔ مجھے اتار دو۔ فوراً اتار دو۔"
اصغر بھائی اور اظہر میاں نے بھی میری نازک حالت کا اندازہ کر کے
محمد چاؤش سے اپیل کی "ہاں بھئی۔ ہاں۔ روکو۔ روکو۔" بنڈی رک
گئی اور میں بحال تباہ بنڈی پر سے اُتر پڑا اور سڑک کے کنارے
ایک طرف سمٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں محمد چاؤش کی ایک دوسری
بنڈی پر نظر پڑی جو سڑک سے دور نشیبی زمین پر ایک گھنے درخت
کے نیچے کھڑی تھی۔ اُس کو دیکھتے ہی اُس نے کہا "صاحب معاف کرو
یہ بنڈی بہت خراب تھی۔ اس سے آپ کو تکلیف ہوئی میں دوسری
اچھی بنڈی بلائے لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے دوسری بنڈی کو آواز
دی جو بلا چون و چرا فوراً آ گئی اور اُس پر ہم لوگ بٹھا دیئے گئے۔
تھوڑی ہی مسافت طے ہوئی تھی کہ اجنتا کی طرف سے ایک بس

آتی دکھائی دی جس میں کھچا کھچ سیاح بھرے ہوئے تھے۔ اُس کو دیکھ کر
محمد چاؤش بنڈی پر سے پھر کود پڑا اور پستول بدست بس کا راستہ
روک کر کھڑا ہوگیا۔ جب وہ رک گئی تو محمد چاؤش نے ڈرائیور کو حکم دیا کہ
"لوٹاؤ اس کو اور پہلے میرے مہمانوں کو اجنتا پہنچاؤ۔" ڈرائیور شاید محمد چاؤش
کو جانتا تھا۔ لہذا اسٹیٹ سے اُتر کر لگا خوشامدیں کرنے۔ گڑگڑا گڑگڑا کر کہ
"سڑک تنگ ہے۔ بس کو گھمانے کی جگہ نہیں ہے۔ ڈھلوان پہاڑی راستہ
ہے۔ مسافر پریشان ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔"
اسی دار و گیر میں ایک کار آتی ہوئی نظر پڑی محمد چاؤش نے
… دیکھ کر کہا "اچھا جاؤ۔ میں اپنے مہمانوں کو موٹر میں لے جاؤں گا۔"
…ال کا یہ فیصلہ سنتے ہی بس والا بے تحاشہ اپنی گاڑی کو لے کر بھاگا۔
مسافروں کو بھی اس آفت ناگہانی سے نجات ملی تو ان میں بھی خوشی
کی لہر دوڑ گئی۔ اس وقت ان بس نشینوں پر مجھے بڑا رشک آیا۔ کاش
میں بھی ان میں سے ایک ہوتا اور مجھے بھی رہائی مل جاتی۔ اس کے
برعکس میں "ابتدائے عشق" کی جانکاہ منزلوں سے گزر رہا تھا۔ کچھ خبر
نہیں کہ کب اجنتا پہونچنا ہوگا کیسے پہنچنا ہوگا اور وہاں پہنچنے کے بعد کیا درگت بنے گی
ان وحشت ناک تصورات سے جی لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ بہرحال وہ
آنے والی کار زن سے ہمارے پاس ہو کر گزری اور محمد چاؤش نے
دوڑ کر اور آواز دے کر اُسے رکوا لیا۔ لیکن جب وہ اس کے پاس پہنچا
تو ہم نے دیکھا کہ اس نے کار کو واپسی کا حکم دینے یا کچھ اور کرنے کے بجائے

کار نشین شخصیت کو جھک کر سلام کیا۔ ایک باریش چشمہ لگائے چہرہ باہر نمودار
ہوا۔ اور کوئی نصف منٹ بات چیت کے بعد ایک خالی لفافہ پر کچھ
لکھوا کر اور دوبارہ سلام کر کے محمد چاؤش ہمارے پاس واپس آگیا۔
کار بھی اپنی راہ چل دی۔ معلوم ہوا کہ کار میں بیٹھے ہوئے بزرگ غلام یزدانی
صاحب ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ تھے۔ اور ان سے محمد چاؤش نے اجنتا
کے غار دیکھنے کا ہمارے لئے بلا فیس پرمٹ حاصل کر لیا۔ ورنہ ہمیں
پانچ روپئے دینا پڑتے۔

اس کے بعد ہنڈی پر ہمارا سفر از سر نو شروع ہوا۔ اور تیس چالیس
منٹ میں ہم بخیریت اپنی منزل مقصود اجنتا پہنچ گئے۔ یہ بقیہ راستہ سکون
سے گذرنے کا سبب یہ ہوا کہ اس وقت محمد چاؤش کے دماغ پر غلام
یزدانی صاحب جیسے بڑے آدمیوں سے اپنے تعلقات کی شیخیاں بگھارنے
کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ ریاست کی کس کس عظیم شخصیت نے اس کی کیسی
کیسی فرمائشیں پوری کیں اور خود اس نے ان کی کیا کیا خدمات انجام
دیں۔ اس کی باتوں سے کتنی کوفت ہوئی۔ حد تحریر سے باہر ہے۔ بہر حال
خونِ جگر پی پی کر یہ منزل تمام کی اور اجنتا پہاڑ کی آخری چوٹی پر
پہنچے۔ جہاں ہنڈی سے اتر کر غار شروع ہوتے تھے۔ پہاڑ میں کٹے ہوئے
ایک تنگ راستہ کی چند سیڑھیاں چڑھ کر پھر چند سیڑھیاں نیچے اتر کر
یہاں کمروں کی قطار اور ایک لانبے برآمدے کے آگے کھلی ہوئی ہموار
زمین ملی۔ اس جگہ محکمۂ آثار قدیمہ کا مقامی دفتر اور ایک صاف ستھرا

ریسٹوران تھا۔

محمد چاؤش کو دیکھتے ہی ریسٹوران کا مالک اور اس کے بیرے
تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ حکم دیا گیا کہ مہمانوں کو عمدہ چائے پلائی
جائے جس کی فوراً تعمیل ہوئی۔ چائے کی میز پر کیک پیسٹریوں اور نمکین
سموسوں کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ محمد چاؤش خود بلحاظ ادب ہمارے ساتھ نہ بیٹھا
بلکہ ہمیں کھانے پینے پر لگا کر خود آثار قدیمہ کے دفتر میں گھس گیا۔ اس وقت
دفتر کے بابو صاحب اپنی ڈیوٹی کا وقت ختم کر کے اور کاندھے پر کوٹ ڈال کر
جانے ہی والے تھے کہ غلام یزدانی صاحب کی تحریر ان کے ہاتھ میں دیکر
اس نے ان سے کہا: "ٹھہرو صاحب ابھی تم نہیں جا سکتے۔ میرے مہمانوں کو
پہلے اچھی طرح سب مندر دکھاؤ۔ اس کے بعد جا سکو گے۔"

بابو: "ارے صاحب آپ صاحبان اس قدر دیر میں کیوں آئے۔
مجھے بس نہیں ملے گی۔ میں اورنگ آباد رہتا ہوں۔

محمد چاؤش: "بک بک مت کرو (پستول دکھا کر) اٹینشن۔" بابو بے چارہ
ایک دم نرم پڑ گیا۔ "ارے صاحب! میں انکار نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو یہ
کہہ رہا تھا کہ مجھے ......"

محمد چاؤش۔ بس! بس! زیادہ بات نہ کر۔ مفت کی تنخواہ پاتا ہے
حرام زادہ۔ کوئی کام نہ کاج!

بابو کی یہ درگت بنتے دیکھ کر ہم لوگ چائے کا سارا مزہ بھول گئے اور
اس خیال سے کہ جس قدر جلد ہم مندروں کی سیر سے فارغ ہو جائیں گے

اسی قدر جلد اس بیچارے بابو کو چھٹی مل جائے گی۔ نیز اس کے صدقہ اور طفیل میں
شاید ہمیں بھی چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ ہم فوراً کھڑے ہو گئے اور بابو
نے کہا " آپ فکر نہ کریں ہم سرسری طور پر دیکھیں گے۔ آپ کو زیادہ
تکلیف نہ ہوگی۔"

کافی شام ہو گئی تھی۔ اجنتا کے تمام مندروں میں اندھیر اگھپ ہو گیا
تھا ویسے بھی چونکہ ان میں ایک ہی رُخ سے روشنی اور ہوا آتی تھی اور
کسی قسم کے روشن دان وغیرہ نہ تھے۔ اس لئے دن دوپہر میں بھی ان
کی صنعت و صناعی کو مصنوعی روشنی کے بغیر دیکھنا ممکن نہ تھا۔ اس
روشنی کے لئے ہر ایک مندر میں بجلی کا ایک ایک پلگ موجود تھا اور ایک
ڈوری میں لگے ہوئے بڑی پاور کے بلب کو ایک آدمی تھامے رہتا اور محکمۂ آثار قدیمہ
کے مذکورہ بابو صاحب پوائنٹر کی مدد سے چھتوں اور دیواروں کے نقش و
نگار اور ان کی فنی خصوصیات کو بتلاتے جاتے۔

اجنتا کے غاروں یا مندروں کی صورت یہ تھی کہ ایک پورے
بالا پہاڑ کو اس کی چوٹی سے سطح زمین تک گھوڑے کے نال کی شکل میں
کھود کھلا کیا گیا تھا سارا کٹائی کا کام اوپر سے نیچے کی طرف ہوا تھا
پہاڑ کے اس خلا کے دامنوں میں آمنے سامنے متعدد منزلوں میں
مختلف النوع اور بھانت بھانت کے مندر بنائے گئے تھے۔ سطح زمین پر ایک
ایک قدرتی چشمہ زور شور سے بہہ رہا تھا۔ اس مقام کو دیکھنے سے ایسا

ہوا کہ بدھ راہبوں نے جو یہاں بود و باش رکھتے تھے اس خیال سے ایسی دشوار گذار
جگہ کو پسند کیا تھا کہ وہ تنہائی میں اور تمام دنیا سے علیحدہ عبادت میں مصروف
رہ سکیں اور بظاہر ان کو اس خیال میں کامیابی بھی ہوئی کیوں کہ بمبئی سے قریب
ہونے کے باوجود زمانۂ دراز تک دنیا کو ان کی موجودگی کا علم نہ ہو سکا۔
صدیوں تک بے انتہا مخلوق کی نشستیں ان تیرہ و تاریک گنبدوں کے
نیچے رہیں اور ان کی سنگ تراشی کا کام بھی جس کے ذریعہ گویا سارا پہاڑ
کاٹ ڈالا گیا کئی سو برس تک ہوتا رہا۔ اجنتا کی قدیم ترین عمارتیں غالباً
۱۵۰ء قبل مسیح کی ہیں جبکہ ہندوستان میں بدھ مذہب اپنے انتہائی عروج
پر تھا۔ اور سب سے آخر عمارات ساتویں صدی عیسوی کی ہیں۔ جب کہ یہ
مذہب سرزمین ہند میں زوال پذیر ہو چکا تھا۔ ان قدیم و جدید عمارتوں
میں صناعی کا زیادہ فرق نہیں تھا۔ فرق تھا تو اس قدر کہ جدید تعمیر میں
آرائش بہت کچھ بڑھ گئی تھی۔ نیز جیسا کہ ہند قدیم کی اور عمارتوں میں پایا
جاتا ہے کسی قسم کی تدریجی ترقی نظر نہیں آتی اجنتا کے جدید مندروں میں
ایک بات یہ بھی تھی کہ بدھ کی مورتیں بہت کثرت سے بنائی گئی تھیں تمام پرستش
گاہیں سنگی مورتوں سے بھری ہوئی تھیں اور ان کے بیچوں بیچ بدھ کی تصویر
اس وقت کی تھی جبکہ اس کو نروان حاصل ہو چکا تھا۔ ان مندروں اور خانقاہوں
کے سامنے اکثر پتھر کے برآمدے تھے جو ترشے ہوئے ستونوں پر کھڑے
تھے اور یہی ستون اندرونی عمارات میں بھی ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ مندروں
سے ملی ہوئی بہت سی خانقاہیں تھیں، ان کی وضع یہ تھی کہ ایک بڑے سے دالان کے

اردگرد چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے تھے اور ہر ایک حجرے میں ایک ایک پتھر
کا بستر تھا۔ دالان جن کے گرد حجرے بنے ہوئے تھے، عبادت گاہ کا بھی کام دیتے
تھے۔ اور ان میں جا بجا چھوٹے چھوٹے حجرے خاص خاص اولیاؤں کی پرستش
کے لئے بنے ہوئے تھے۔ جیسا اکثر کیتھولک گرجوں میں ہوتا ہے۔ آخیر زمانے
کی خانقاہیں اس قدر بڑی ہو گئی تھیں کہ چھت کو قائم رکھنے کے لئے بہت زیادہ
ستون بنانے کی ضرورت پڑی۔ اگرچہ یہ چھتیں خود پہاڑ تراش کر بنائی گئی تھیں۔
اجنٹا میں بعض دالان اس قدر بڑے تھے کہ ان میں ۲۴-۲۴ بڑے سنگین ستون
چھت کو قائم رکھنے کے لئے تراشے گئے تھے۔

دالانوں کے آخیر حصے میں ہمیشہ بدھ کی ایک بہت بڑی مورت ہوتی
تھی اور اس کے گرد اور اشخاص کی مورتیں ہوتی تھیں۔ ستون اور چھتیں رنگین
تصویروں اور آرائشوں سے لسی ہوئی تھیں۔ جن میں بدھ کی زندگی کے مختلف
واقعات دکھائے گئے تھے۔ اگرچہ یہ تصویریں بہت اچھی حالت میں نہ تھیں لیکن
تاریخی لحاظ سے یہ نہایت دلچسپ تھیں۔ کیونکہ قدیم ہند کی صرف یہی رنگین تصویریں
ہم تک پہنچی ہیں، ان کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح تک پہنچتا تھا اور جو اشخاص
ان میں دکھائے گئے تھے ان کی صورت و شکل، لباس اور بالوں کی وضع صاف
نظر آتی تھی۔[1]

اجنٹا کی ان عمارات کو جن کی تعمیر میں لاتعداد انسانوں کی محنت اور تقریباً
ایک ہزار سال کی مدت صرف ہوئی تھی تفصیل سے دیکھنے کے لئے کافی اطمینان اور

[1] تمدن ہند صفحات ۳۵۵ تا ۳۵۷۔

صت درکار تھی اور اس وقت یہی دو چیزیں ہمارے لئے عنقا تھیں۔ ہر چیز کو جلدی
دی دیکھنے کے باوجود مغرب کا وقت ہو گیا۔ اور محمد چاؤش جو اس عرصہ میں
نٹا سے متعلق سرکاری مہمان خانہ میں ہماری شب باشی اور خورد و نوش کے
ظام کے لئے چلا گیا تھا وہاں سے واپس آ کر بھوکے شیر کی طرح ہمارا انتظار
ٹہل رہا تھا۔ اس وقت ہمارے جذبات یہ تھے اور محمد چاؤش سے ہماری
اری اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ اگر اجنٹا کے غاروں سے باہر نکلنے کا ایک
راستہ نہ ہوتا تو ہم اس کو پسند کرتے کہ کسی دوسری طرف سے چپ چاپ
ل جائیں اور چاہے ساری رات پہاڑوں اور جنگلوں میں ٹکریں مارتے پھریں
اس کے ہاتھ دوبارہ نہ پڑیں۔ بہر حال تن بہ تقدیر ہم نے اپنے آپ کو
خندہ ہنسی ہنسکر از سر نو اس کے حوالے کر دیا۔ اس عرصہ میں وہ کہیں سے
راب پی آیا تھا اور اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ سواری کے لئے
ی موجود تھی۔ کوئی تین فرلانگ کے فاصلہ پر سرکاری مہمان خانے
لے تھے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ پورا اسٹاف وردیاں پہنے مع داروغہ
بستہ مودب کھڑا تھا۔ سب نے سرو قد فرشی سلام کئے۔ ایک نہایت
کمرہ ہمیں پیش کیا گیا جس میں تین مسہریوں پر عمدہ بستر بچھے ہوئے
غسل خانہ میں صاف ستھرے تولئے۔ گرم پانی اور صابن موجود
۔ محمد چاؤش ملازموں اور خدمت گاروں کی جان پر مسلط ڈانٹ ڈ
پٹ دے رہا تھا۔ "یہ چادر ٹھیک نہیں ہے۔ یہ تکیہ خراب ہے۔ وہ پلنگ
بچھا ہے۔ اس طرف کرسیاں لگاؤ۔ ادھر کھانے کی میز رکھو۔

صاحب لوگوں کی شیروانیاں اُتارو، اس طرح جھاڑو اور ٹانگو، چپل رکھو،
جوتا کھولو۔ موزہ اتارو۔ کنگھا لاؤ۔ آئینہ کہاں ہے" وغیرہ وغیرہ۔ القصہ ہم
لوگ منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوئے تو اجنتا کے ریسٹورانٹ سے بھی زیادہ پرتکلف
چائے میز پر رکھی گئی۔ اور جب تک ہم چائے پیتے رہے محمد چاؤش زمین
آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا۔ میرا وہم کہیئے یا کیا میں اس ساری خاطر تواضع
کو بالکل ایسا سمجھتا رہا جیسے کہ قربانی سے پہلے بکرے کی خوب ملائی والی
اور کھلائی پلائی کی جاتی ہے۔ اس تصور اور دن بھر کی رگید سے میرا
جسم کا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اور شدت درد سے
جا رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اس پر مستزاد تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب چائے کے
بعد محمد چاؤش نے کہا کہ "چلو صاحب بڑا مہمان خانہ دیکھنے چلتے جس میں
وائسرائے ٹھہرتا ہے" تو میں نے اپنی مذکورہ جسمانی تکالیف بتا کر جانے سے
انکار کر دیا۔ اس پر اس نے دو خادموں کو حکم دیا کہ "صاحب کے ہاتھ
دباؤ۔ سر میں تیل ڈالو۔ اور دیکھو جب تک میں لوٹ کر آؤں برابر یہ کام
کرتے رہنا" یہ احکام دے کر محمد چاؤش، اصغر بھائی اور اظہر میاں کو
ساتھ لے کر چلا گیا۔ اور میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ خادم بیچارے حکم کے
بندے فوراً ڈیوٹی پر لگ گئے۔ تھوڑی دیر ہاتھ پیر اور سر دبوانے کے
بعد میں نے ان لوگوں سے کہا۔ "بس بھائی! اب رہنے دو۔ میں ٹھیک
ہوں" لیکن وہ بولے "نہیں صاحب یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر اُس نے دیکھ لیا تو وہ ہمیں
سے مار دیگا"

اچھا بھائی دباؤ۔ دبائے جاؤ۔ جب تک تمہاری مجبوری تم سے یہ کام کرائے،
خواہ ان کو احساس ہو یا نہ ہو کیونکہ وہ اس قسم کی خدمت گاری کے عادی رہے
ہوں گے۔ لیکن میرا جذبۂ انسان دوستی اس وقت بے طرح مجروح ہو رہا تھا۔
بظاہر میرے جسم کو راحت پہنچائی جا رہی تھی۔ لیکن بباطن مجھے ایسا معلوم ہو رہا
تھا جیسے مسلسل چھریوں سے زخمی کیا جا رہا ہوں۔ انسانیت کی اس درجہ تذلیل
اور گراوٹ اور وہ بھی بلا معاوضہ کیونکر راحت رساں ہو سکتی تھی۔

بہرحال قریب دس بجے شب میرے ساتھی اور محمد چاؤش بڑے
مہمان خانے کی سیر کر کے واپس آئے۔ مجھ پر متعین خدام کو چھٹی ملی اور میز پر
کھانا چنا گیا جس میں مرغ مسلم۔ مرغ پلاؤ۔ شامی کباب۔ قورمہ۔ پڈنگ۔ فیرنی۔
اور خدا معلوم کیا کیا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور ہوا۔ محمد چاؤش اس وقت
بھی کھانے میں شریک نہ ہوا بلکہ کھانے کے اہتمام اور داروغۂ مطبخ اور اس کے
ماتحت ملازمین کو زمین پر بیٹھے بیٹھے ہدایات دیتا رہا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہوتے ہوتے رات کے بارہ کا عمل ہو گیا لیکن
محمد چاؤش کو مہمان خانے سے چند میل دور اپنے گھر واپس جانے کی مطلق فکر نہ
تھی۔ بڑے اطمینان سے ہر قسم کی اوٹ پٹانگ بک بک جھک جھک میں لگا ہوا
تھا۔ یا اللہ اس ظالم سے کب نجات ملے گی۔ کیا رات بھر یہیں نازل رہے گا اور
رات کی تاریکی میں نہ معلوم کیا واردات کرے گا۔ بالآخر اصغر بھائی سے میں نے
کہا کہ کسی طرح اس کو دفعان کریں۔ تو انھوں نے اس سے فرمایا "اچھا بھائی محمد
اب تم اپنے گھر جاؤ۔ صبح کو ملاقات ہو گی۔ تم بھی تھک گئے ہو گے اور ہم بھی

اب سوئیں گے۔"

محمد چاؤش۔ نہیں صاحب تھکنے کی کیا بات ہے۔ آپ لوگ روز روز ا
کب آتے ہیں۔ اور صاحب آپ نے میرا کچھ دکھ درد تو سنا ہی نہیں۔ میں نے
کر کھانے کے بعد اطمینان سے سب حال سناؤں گا۔ میری ایک گھر والی ہے
جس سے مجھے بہت محبت ہے۔ وہ بیمار ہے۔ ہزاروں روپئے اس کے
علاج میں خرچ کر دئے۔ مگر ٹھیک نہیں ہوتی"...... یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ
کر اور چیخیں مار مار کر رونے لگا.... اور صاحب اگر وہ مر گئی تو پستول
سینہ پر رکھ کر میں بھی مر جاؤں گا ......"

جب شرابی آدمی رونے پر آتا ہے تو اس کا منظر بہت ہی گھناؤنا ہوتا
ہے۔ دن بھر کی غرفش اور اکڑفوں کے بعد اب محمد چاؤش کے رونے دھونے
نے طبیعت کو بہت ہی منغص کر دیا۔ بہر حال اصغر بھائی نے تسلی تشفی دے کر
اور بہت کچھ سمجھا بجھا کر اسے رخصت کیا۔ لیکن چلتے وقت اس نے ان سے وعدہ
لیا کہ صبح اورنگ آباد واپس لوٹنے سے پہلے اجنٹہ گاؤں میں ہم لوگ اس کے
یہاں ضرور ٹھہریں گے اور دعوت کھائیں گے۔ مزعومہ دعوت کے چکر میں اس
دن ہم پھر کس مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس کے تصور سے دل پریشان
ہونے لگا اور پروگرام یہ بنا کہ ہم لوگ صبح پانچ بجے روانہ ہونے والی پہلی
بس سے نکل جائیں۔ اور جب بس محمد چاؤش کے مکان کے پاس سے گزرے
تو وہ اس وقت پڑا سوتا ہو گا۔ اس پروگرام کے تحت بمشکل چار گھنٹہ سو کر
ہم لوگ علی الصباح اٹھ بیٹھے۔ قریب ہی جس جگہ سے بس روانہ ہوا کرتی

وہاں پہنچ کر پہلی گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ میں بس اجنٹہ گاؤں
پہنچی اور عین محمد چاؤش کے دو منزلہ مکان کے سامنے جا کر ٹھہری جہاں سے اُسے
اور سواریوں کو لینا تھا۔ اور ہمارے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ محمد چاؤش
ہمارے انتظار میں موجود تھا۔ میں تو اسے دیکھ کر پہلے کے بیٹھے ہوئے دوسرے
مسافروں کی آڑ میں دبک گیا۔ اصغر بھائی کو کوئی مفر نہ تھا لہذا السلام علیک
کے بعد ان کا اور محمد چاؤش کا مکالمہ شروع ہو گیا۔ ایک طرف سے اجنٹہ ٹھہرنے
کا اصرار اور دوسری طرف سے انکار۔ صبح کا وقت چونکہ قوت و تازگی کا
ہوتا ہے اس لئے اصغر بھائی اپنے ارادہ پر جمے رہے اور محمد چاؤش ہر چند
گڑگڑایا مگر انھوں نے اس کی ایک نہ سنی اور جب جانے والی سواریاں
بیٹھ گئیں تو انھوں نے اپنے مخصوص تھانے دارانہ لہجہ میں ڈرائیور کو حکم دیا کہ
"چلاؤ گاڑی"۔ گاڑی چل دی اور محمد چاؤش ہاتھ ملتا رہ گیا۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

ایک دن مزید اورنگ آباد میں قیام کر کے میں اور اظہر میاں حیدرآباد
واپس آئے اسی روز شب کو اپنے میزبان کرنل معین صاحب کے ہمراہ مجھے
ریاست کے معتمد دفاع کے یہاں کھانے پر جانے کا اتفاق ہوا ادھر ادھر
کی سیاسی و غیر سیاسی باتوں کے بعد میں نے ان موصوف کو اجنٹہ کے سفر میں
پیش آمدہ واقعات سنائے اور عرض کیا کہ ایک بین الاقوامی شہرت والی
سیرگاہ میں محمد چاؤش جیسے غیر ذمہ دار اور خونخوار آدمی کو آزاد چھوڑ کر

حکومت کی جانب سے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا جا رہا ہے اس کا انجام بہت بُرا ہوگا۔

میرے معروضہ کا جواب دیا گیا کہ

"صاحب آپ کس دنیا کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں محمد چاؤش کو جانتا ہوں وہ بیچارہ تو بڑا مسکین اور فرماں بردار آدمی ہے۔"

اس جواب پر مشتعل ہو کر میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ کرنل معین صاحب نے میرا ہاتھ دبایا، مطلب یہ تھا کہ اگرچہ تم ٹھیک کہتے ہو لیکن معتمد صاحب جیسی عظیم المرتبت شخصیت کی رائے سے اختلاف کرنا مناسب نہیں ہے۔ مجبوراً میں خاموش ہوگیا۔

چار سال صرف چار سال بعد ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد میں پولس ایکشن ہوا اور اصغر بھائی نے مجھے کراچی میں بتایا کہ بھارتی فوج کا ایک دستہ ایسا بھی پہنچا جس کا محمد چاؤش نے اپنے دو منزلہ مکان کی چھت پر چڑھ کر بندوق سے مقابلہ کیا۔ کچھ دیر دو طرفہ گولی چلنے کے بعد محمد چاؤش زخمی ہو کر گر پڑا اور مذکورہ فوجی دستہ کے افسر نے اُسی حالت میں اُس کو اٹھوا کر اپنے ٹرک کے پہیے سے بندھوا دیا اور اُسے تیز دوڑوا دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں محمد چاؤش کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

شوکت علی خاں

(۱۹۶۰ء)

۲۵ر فروری ۱۹۶۰ء کو صبح ۴ بجے عزیز و محترم دوست مولوی شوکت علی خاں کا حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم عارضۂ قلب میں کئی سال سے مبتلا تھے اور آخر میں اُسی کا شکار ہوگئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

شوکت علی صاحب صحیح معنیٰ میں "قومی آدمی" تھے۔ میرٹھ اور اس شہر کے رئیس و زمیندار ہونے کے باوجود زندگی بھر مسلمانوں کی بہبودی کے کاموں میں پُرجوش حصہ لیتے رہے۔ بطور اعترافِ خدمات قوم نے بھی ان کو یو۔ پی اسمبلی اور کراچی میونسپل کارپوریشن کا ممبر منتخب کیا۔ مرکزی صوبائی مسلم لیگ کے نظامِ کار میں امتیازِ خاص کے مالک تھے۔ آخری دور میں کل پاکستان انجمن ترقی اُردو کے اعزازی خازن تھے۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور اُس کے قائم کردہ سرسید گرلس کالج کے بھی خصوصی سرپرستوں میں سے تھے۔ کبھی اخلاقی و مالی اعانت سے گریز نہ کیا۔ شوکت علی خاں صاحب مرحوم ایک مخلص اور حد درجہ

خوش مزاج دوست تھے۔ جو بھی اُن سے ایک دفعہ مِل لیتا پھر کبھی اُن کو نہ چھوڑتا۔

ہمیں اس جاں کاہ حادثہ میں اپنی عزیز بہن بیگم شوکت علی خاں سے دلی ہمدردی ہے بالخصوص اس وجہ سے کہ اُن کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ بیگم شوکت کانفرنس کے شعبۂ نسواں کی مجلسِ انتظامیہ کی نہایت سمجھدار کارکن ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ سوشل کاموں سے متعلق اپنی سرگرمیوں کو بدستور جاری رکھیں گی۔ کیونکہ کامیاب زندگی بسر کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ نہیں ہے۔

سیّد برکات احمد (علیگ)

(سنہ ۱۹۶۰ء)

ع ۔ ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

"العلم" کے زیر نظر شمارے میں "غدر کی کہانی" کی دسویں قسط شائع ہو رہی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کہانی کے فاضل مترجم جناب سید برکات احمد صاحب (علیگ) کا یکم مئی سنہ ۱۹۶۰ء کو ملیر کراچی میں انتقال ہو گیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

اب یہ کہانی غالباً ناتمام رہے گی۔ کیوں کہ مرحوم بوجہ ضعف و کبرسنی تھوڑا تھوڑا ترجمہ کر کے بھیج رہے تھے اور اصل کتاب کا بڑا حصہ ترجمہ ہونا باقی تھا۔ اصل کتاب کم یاب ہے اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کبھی ہمیں دستیاب بھی ہو سکے گی تاکہ بقیہ حصہ کا ترجمہ دیا جا سکے۔ ویسے بھی جیسا رواں سلیس اور یہ ہمہ وجوہ کامیاب ترجمہ سید صاحب کر رہے تھے۔ کوئی دوسرا شخص شاید ہی کر سکے۔

سید برکات احمد صاحب شاہجہاں پور (روہیل کھنڈ) کے رہنے والے

تھے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے۔ بریلی بدایوں وغیرہ میں منصرم عدالت رہے۔ اس سے زیادہ حالات بالفعل ہمیں معلوم نہ ہوسکے دلی آرزو کے باوجود مرحوم سے کبھی بالمشافہ ملاقات نہ ہوسکی۔ مگر مرحوم کی اعلم نوازی نے ہمارے دل پر ان کے اخلاق حسنہ کا گہرا نقش چھوڑا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ مرحوم کے پسماندگان سے ہمیں دلی ہمدردی ہے خدائے بزرگ ان کو ہمت دے کہ اس صدمے کو رضائے الٰہی سمجھ کر صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرسکیں۔

ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں اور مقصود حسین خاں

سنہ ۱۹۶۰ء

برُرخِ زردم ببیں خطہائے خونیں از سرشک
کایں ورق در حسبِ حالِ دردمنداں دفتریست (جامی)

قومیں افراد کی جد وجہد سے بنتی ہیں اس لئے ملک وملت کی تعمیری خدمت [کر]نے والے افراد کی قدر وقیمت بے حساب ہوتی ہے۔ کراچی کی تعلیمی دنیا میں [ما]سٹر مقصود حسین خاں انسپکٹر آف اسکولز اور ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں رجسٹرار [کرا]چی یونیورسٹی ہماری ملت کے ایسے ہی دو افراد تھے جن کے دم قدم سے [بڑ]ے بڑے معرکے کے کام انجام پا رہے تھے۔ اور تعلیمی ترقی کے میدان [کو] ان لوگوں نے اپنی قابلیت۔ ایثار اور ہمدردی بنی نوع انسانی کے [جذ]بہ سے کافی وسیع کردیا تھا۔ یوں کہنے کو وہ کوئی بہت بڑے عہدیدار [نہ تھ]ے لیکن خود ان کی اپنی بڑائی نے ان کے کام کو غیر معمولی اہمیت [د]ے رکھی تھی۔ چنانچہ یکم نومبر اور ۲۵ر نومبر سنہ ۱۹۶۰ء کو علی الترتیب [صر]ف پچیس دن کے قلیل عرصہ میں وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا [ہو]گئے تو احساس ہو رہا ہے کہ ان کی عظیم ذمہ داریوں کو مثل [ا]ن کے سنبھالنے والا کوئی دوسرا شخص دور دور موجود نہیں ہے۔ ع

قرن ہا باید کہ یک صاحب دلے پیدا شود

زبان وقلم کی شوخی ورعنائی، مزاجوں کی جودت وجولانی۔ قابلیت و
صلاحیت کار کی فراوانی۔ فکر ونظر کی گہرائی اور انتھک محنت کے باوجود
عجز وانکسار۔ عزیزوں کے عزیز۔ دوستوں کے دوست حتیٰ کہ دشمنوں
کے بھی دوست۔ ایسے لوگ کیا آسانی سے ہاتھ لگتے ہیں؟

اسکول، کالج اور یونیورسٹی قوم سازی کے چھوٹے بڑے کارخانے
ہیں۔ اُن کو چلانے اور دوسروں سے چلوانے کے لئے وسعتِ قلب و
نظر مہارتِ فن اور تنظیمی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسٹر مقصود حسن
خاں اور ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں اپنے اپنے دائرہ کار میں ان صفات سے
بدرجۂ اتم حامل تھے۔ مقصود صاحب اُردو۔ انگریزی اور فارسی ادب
بھی عبورِ کامل رکھتے تھے۔ حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی رحمۃ اللہ
علیہ کے نواسے تھے اس لئے ذوقِ علم وادب ورثہ میں پایا تھا۔ ڈاکٹر عبادالرحمٰن
صاحب پاکستان آنے سے پہلے صوبہ یو۔پی کے ڈائرکٹر تعلیم اور صحیح معنی میں
ماہرِ تعلیم تھے۔ خصوصاً علمِ جغرافیہ کے مسلم الثبوت اُستاد تھے اس وقت پاک و
ہند کی قریب قریب تمام یونیورسٹیوں اور بڑے بڑے کالجوں میں انھیں کے
شاگرد یا اُن کی نگرانی میں کام کئے ہوئے لوگ جغرافیہ ڈپارٹمنٹوں کے
ہیڈ ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے مشہور ومعروف ڈپارٹمنٹ کے بھی وہی معمار
اوّل تھے جس کا موصوف نے غالباً ۱۹۳۰ء میں لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی
کرنے کے بعد چارج لیا تھا اور ہمارے بھی اُسی وقت سے اُن سے
گہرے مخلصانہ تعلقات تھے۔

ان حضرات کی پرائیویٹ صحبتیں لاجواب تھیں۔ ڈرائنگ روموں کا
سامان اور اُن کی ترتیب اُن کی نفاست پسندی کا ثبوت۔ نشست وبرخاست
اور خاطر ومدارات کا معیار تہذیب نفسی کی دلیل۔ موضوع ومباحثِ گفتگو کی
ندرت وپاکیزگی خوب پڑھے لکھے ہونے کی دلیل۔ لطائف وظرائف میں شستہ
لطیف کی بہتات ذہانت وفطانت کی آئینہ دار۔ الغرض اُن کی کس کس
خوبی کو یاد کیا جائے۔ افسوس دو اچھے اور بہت ہی اچھے انسانوں سے
دُنیا خالی ہو گئی۔ اللہ سے دُعا ہے کہ اُن کی خدماتِ ملّی کو قبول فرمائے۔
اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کے غم دیدہ پسماندگان کو اُن کے
نقشِ قدم پر چلنے کی توفیقِ نیک ارزانی فرمائے۔ آمین۔

جگر مُراد آبادی

۱۹۶۰ء

دور ہیں شعر و ادب کا جام و پیمانہ نہیں
لکھنے والا اب کوئی تاریخ میخانہ نہیں

۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو آل انڈیا ریڈیو نے یہ دلدوز خبر نشر کی کہ حضرت جگر مراد آبادی اس جہان فانی کو خیر باد کہہ کر رہ گرائے عالم باقی ہوئے۔ جگر نے ستر سال دُنیائے رنگ و بو کی سیر کی جس کا بڑا حصہ چمنستان شعر و ادب اُردو کی آبیاری میں صرف ہوا۔ آپ غزل گو شعراء میں امام کا درجہ رکھتے تھے اور رئیس المتغزلین کا خطاب آپ کے لئے سزاوار ہے۔

ماضی قریب میں یہ سوال زوردار بحث کا موضوع رہ چکا ہے کہ غزل موجودہ زمانہ کے تقاضوں سے کہاں تک ہم آہنگ ہے یا ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ جدید شاعری کے اکثر دلدادگان عصر حاضر میں غزل گوئی کی افادیت کے یکسر منکر ہیں۔ مگر غزل گوئی جس کی بنیاد ان اقدار پر ہے جو فطرت نے انسانی خمیر میں ودیعت کی ہیں اب بھی اپنا مقام قائم رکھے ہوئے ہے۔

غزل کو ہر دلعزیز بنانے اور شعری حسن عطا کرنے میں جن شعراء کا ہاتھ ہے

ان میں جگر مراد آبادی کو یقیناً ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اُنھوں نے اُردو غزل کو ترنم۔ موسیقیت۔ روانی اور اظہار جذبات کی وہ کیفیتیں عطا کیں جو تغزل کی جان ہیں۔ وارداتِ حسن و عشق کے اظہار میں اُنھوں نے جس سلیقہ سے کام لیا وہ کم شعرا کو نصیب ہوا ہے۔ ان کی غزل گوئی کی خصوصیات نے نہ صرف بیسویں صدی کے غزل گو شعرا کے کلام کو متاثر کیا ہے بلکہ خود غزل کو عمر جاوید بخشی ہے۔ ان کے کلام کے چند مجموعے "شعلۂ طور"۔ "آتش گل"۔ "دیوان جگر" طبع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا شمار ان چند خوش نصیب اہم شخصیتوں میں ہے جن کو اپنی زندگی ہی میں عزت و شہرت کی بلند و بالا چوٹیوں پر دسترس حاصل ہوئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ بھارتیہ ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے ان کے مجموعۂ کلام "آتشِ گل" پر پانچ ہزار روپیہ کا انعام وزیر اعظم بھارت پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھ سے عطا ہوا۔ ایامِ علالت میں بھارتی حکومت نے علاج کے لئے پانچسو روپیہ بطور امداد منظور کئے اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار بطور وظیفہ مرکزی حکومت بھارت کی جانب سے اور ایک سو روپیہ ماہوار وظیفہ گورنمنٹ۔ یوپی کی طرف سے منظور کیا گیا۔

حضرت جگر مراد آبادی نہ صرف عظیم شاعر تھے بلکہ گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے بحیثیت انسان وہ شریف النفس فیاض طبع۔ ایثار پسند اور انسان دوست تھے۔ ان کی شرافت ان کا ایثار ان کی محبت۔ ان کی اُردو نوازی حلقۂ احباب میں آج تک ضرب المثل ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

رئیس المتغزلین۔ حضرت جگر کی وفات سے اُردو غزل کا وہ دَور ختم ہوگیا جو
حسرت۔ فانی۔ یاس۔ یگانہ اور اصغر کی شاعری کے ساتھ ساتھ
پروان چڑھا تھا۔ غزل گو شاعر ہونے کے باوجود وہ اپنے گردوپیش سے
بیگانہ نہ رہے۔ زندگی کے حادثات اور روزمرہ کے واقعات سے بھی
ان کے جذبات متاثر ہوتے تھے مگر ان کے اظہار کے لئے بھی اُنھوں
نے غزل ہی کے قالب کو اختیار کیا۔

ذاتی حالات کے اعتبار سے حضرت جگر مجوبۂ روزگار تھے۔
مراد آباد کے ایک شریف مگر متوسط الحال خاندان کے فرد تھے۔ ابتداءً
کسب معاش کے لئے چشمہ کی تجارت کرتے تھے۔ تعلیم بھی معمولی تھی
لیکن قدرت نے جو زور طبیعت ان کو عطا کیا تھا۔ اس کی بدولت
تنگ دستی اور تعلیم کی کمی ان کی ترقی میں مانع نہ ہوئی۔ دنیا کے اکثر
بڑے آدمیوں میں یہ صورتِ حال مشترک نظر آئے گی۔ دراصل ہوتا یہ
ہے کہ اولوالعزم اور حساس طبیعتوں کو اسباب ظاہری کا فقدان تازیانہ کا
کام کرتا ہے اور وہ صاحبِ اسباب لوگوں کے مقابلہ میں محنت و مشقت
کے بل پر سبقت لے جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو زندگی میں آسانی ہی آسانی
اور کامیابی ہی کامیابی نصیب ہوتی ہے وہ ایک محنت کش جاں باز
کے مقابلہ میں ترقی کی دَوڑ میں پیچھے رَہ جاتے ہیں۔ موجودہ نظام تعلیم
کی روشنی میں یہ روزانہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہمارے بیشتر۔ ایچ
ڈی حضرات کی تحقیقات کا موضوع اُن لوگوں کی تخلیقات ہوتی ہیں

یٹرک پاس بھی نہ تھے۔
ادب کے محققین آئندہ جگر اور کلامِ جگر پر بھی تحقیقات کر جائے گے
اور ہماری یونیورسٹیوں سے ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں ملا کریں گی۔
قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیت کو کام میں لانے اور اپنے مرغوب علم و
فن میں کمال حاصل کرنے کی جہدِ صادقہ کا یہی ثمرہ ہوتا ہے اور۔ ہماری
نوجوان نسلوں کو جگر کی زندگی سے اسی سبق کو حاصل کرنا چاہیے۔

خان بہادر مولوی حبیب اللہ خاں

(سنہ ۱۹۶۱ء)

جائے ادب، "ولایت منزل" والے خان بہادر الحاج ڈاکٹر مولوی
محمد حبیب اللہ خاں صاحب کا ۱۴ر مارچ ۱۹۶۱ء کو انتقال ہوگیا۔ نوّے سال
سے زائد کی عمر پائی۔ شاہ جہاں پور (روہیلکھنڈ) کے نہایت اعلیٰ خاندان
کے فرد تھے۔ سرسیدؒ کی حیات ہی میں ایم اے او کالج سے گریجویٹ ہو
اور اُس زمانے کے معزز عہدۂ ڈپٹی کلکٹری پر فائز ہوکر غالباً ۱۹۲۵ء
میں پنشن پائی اور مستقل سکونت علی گڑھ ہی میں اختیار کر لی۔ قومی کاموں
میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم کے دستِ راست
اور اُن کے انتقال کے بعد اصلاح و ترقی مسلم یونیورسٹی و ایجوکیشنل
کانفرنس کے مشن میں اپنی پوری زندگی صرف کردی، بے حد دیانتدار
اور قاعدہ قانون کے شدت سے پابند ہونے کی بنا پر علی گڑھ کے اکثر
لوگوں سے ہمیشہ ان بن رہی۔ ان کے کیرکٹر میں لچک نام کو نہ تھی
سچے، صاف اور کھرے۔ بلا روو رعایت بڑی سے بڑی شخصیت کو
قومی مفاد میں ٹوک دینے میں آنھیں ذرا بھی جھجک نہ ہوتی تھی۔

وہ بڑے خداترس، مجسمِ علم دوست اور مثالی دوست نواز تھے۔ ذاتی عناد
کسی سے نہ تھا۔ دوستوں اور دوستوں کی اولاد تک کے لئے ایسی ایسی
بے مثل قربانیاں کرتے کہ حیرت ہوتی تھی۔

پاسِ وضع اور پاسِ شرافت اُن کی رگ رگ میں کچھ اس طرح رچی
بسی ہوئی تھی کہ اُن کی ذات سے کسی گھٹیا کام کو منسوب کرنا اُن کے مخالفین
تک کے لئے ممکن نہ ہوتا تھا۔ مسائل مسلم یونیورسٹی میں گہری معلومات رکھتے
تھے۔ بلکہ اُن کو علی گڑھ کی مجسم تاریخ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لکھنے پڑھنے کا
بہت اونچا ذوق تھا۔ متعدد بلند پایہ کتابوں کے مؤلف تھے۔ علی گڑھ میں
آفتاب ہوسٹل اُن ہی کا تعمیر کردہ تھا۔ برصغیر پاک و ہند میں لاتعداد
علی گڑھ اولڈ بوائے جناب خاں صاحب کا دل سے احترام کرتے تھے اور
اب جب کہ وہ ہم سے جدا ہوکر اپنے معبودِ حقیقی سے جاملے تو اُن کی غائبانہ
عقیدت کبھی دلوں سے محو نہ ہوگی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

راجہ سلیم پور

ابھی حال میں جناب راجہ صاحب سلیم پور کی اندوہناک موت ہوئی ہے مرحوم اودھ
کے ایک ممتاز تعلقدار ہونے کے باوصف سراپا قومی آدمی تھے۔
ان کی ذات جس طرح قوم کی ہر خدمت کے لئے وقف تھی۔
اسی طرح سلیم پور ہاؤس (قیصر باغ لکھنؤ) مسلمانوں کی قومی
تحریکات اور کارکنوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ گزشتہ ۴۰ سال
کے عرصہ میں ہر طبقہ کے کتنے لوگ ان کے مہمان ہوکر ان کے خوان
نعمت سے متمتع ہوئے اُس کا اندازہ اور شمار ناممکن ہے اسی بذل
وسخا اور مہمان نوازی کی بدولت قیام پاکستان کے وقت تک سات
روپئے کے مقروض ہوچکے تھے۔ مرحوم اپنی بے نظیر قربانیوں کا
کوئی صلہ لینے پاکستان نہ آئے۔ اللہ جانے خاتمہ زمینداری کے
اب تک اُن پر کیا گزری۔ کیوں کہ بے حد باوقار اور خوددار بزرگ
اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس مرحوم کو عاقبت میں مقام رفیع عطا فرما
کیوں کہ عقبیٰ کا صلہ ہی سب سے بڑا صلہ ہے۔

مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ)

(سنہ ۱۹۶۳ء)

پیدائش ۱۸؍ دسمبر ۱۸۶۸ء۔ انتقال ۳۰؍ مارچ ۱۹۴۶ء

گو مدتیں ہوئی ہیں کسی سے چھٹے ہوئے
حالت مگر وہی ہے دلِ بے قرار کی

غالباً ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ ناکامیوں اور مایوسیوں نے دل ودماغ پر کچھ ایسا
غلبہ کیا کہ زندگی سے بیزاری حدِ انتہا کو پہنچ گئی۔ ارادہ کیا کہ کیوں نہ خودکشی
کرلی جائے۔ لیکن میری عادت ہے کہ ہر اچھے بُرے کام میں مشورہ ضرور
کیا کرتا ہوں۔ چنانچہ خودکشی کے سلسلہ میں طے کیا کہ سہارن پور جاکر اپنے مُخلص
بزرگ مولانا سید طفیل احمد صاحب منگلوری سے رُخصتی ملاقات کرلی جائے اور
خودکشی کے وہ سب اسباب بھی بیان کردئے جائیں جو میں کسی اور کو نہ بتاسکتا تھا۔
اُن دنوں مولانا صاحب کے صاحبزادے مسٹر محمد احمد کاظمی ایڈوکیٹ جو بعد کو ہند
پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے سہارنپور میں وکالت کرتے تھے۔ مجھے خبر نہ تھی کاظمی صاحب
کے مکان پر پہنچ کر اور مولانا صاحب سے مل کر معلوم ہوا کہ اُن کے گھر کے دو
جوان لڑکے دریائے جمنا میں ڈوب کر حال ہی میں مرگئے ہیں۔ میں اس حادثہ جانکاہ
کی اطلاع سے دم بخود ہوگیا۔ مولانا سمجھے میں تعزیت کے لئے آیا ہوں، بہت متاثر

ہوئے۔ اب میں اپنا قصہ تو بھول گیا۔ مولانا کی غم خواری میں لگ گیا لیکن تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس وقت اُن کا نظریہ ہی دوسرا تھا، فرمانے لگے کہ آگے پیچھے مرنا تو سب ہی کو ہے جو جلدی مر جائے وہ نفع میں رہتا ہے اور اُس کو اس قسم کے صدمے اُٹھانے نہیں پڑتے جیسے کہ ہم اس وقت اُٹھا رہے ہیں ہر شخص درازیٔ عمر کی دُعا مانگتا ہے۔ لیکن زندگی کا جو دن گزرتا ہے اُس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ بالکل ہی کم عمری میں کوئی اس دُنیا سے گزر جائے تو اُس کے نفع کی تو حد ہی نہیں، دُنیا اور عقبیٰ میں محاسبۂ اعمال اور قبر۔ قیامت اور دوزخ کے سارے دغدغوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اس دُنیا میں عمر چاہے نئو سال کی ہو بہر صورت مختصر اور عارضی ہوتی ہے جو لاکھوں سال کی ابدی زندگی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ؎

ہر آنکہ زاد بنا چار بایدش نوشید ز جام دہر مے کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

مولانا صاحب کی یہ باتیں میں نے سُن کر کہا کہ اچھا تو اب میری گزارش سُن لیجئے اور پھر میں نے اپنے آنے کی اصلی وجہ بتائی ۔ اس پر بولے،

"خودکشی اضطراری فعل ہے۔ اختیاری نہیں تم خودکشی نہیں کر سکتے۔ اگر تم سے یہ چیز ممکن ہوتی تو بریلی سے چل کر مجھ سے سہارن پور مشورہ کرنے نہ آتے۔"

میں نے اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ واقعی مولانا ٹھیک کہتے ہیں۔ چار پانچ روز ہی میں۔ بیوی بچے۔ دوسرے متعلقین اور احباب کی یاد رہ رہ کر چٹکیاں لینے لگی تھی۔ اُس وقت میرے ہاتھ میں ایک کتاب بھی تھی۔ جس کو دیکھا تو وہ ریلوے ٹائم ٹیبل تھا جو غالباً بریلی واپس جانے والی

ٹرینوں کے اوقات دیکھنے کے لئے میں نے میز پر سے اُٹھایا تھا ؎

گئے تھے درد دل لے کر جہاں سے
وہیں پھر ہم کو لایا جا رہا ہے
(رفتا بدایونی)

مولانا کے قائم کردہ مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول علی گڈھ میں اسی سال آل انڈیا پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ تاریخ اجلاس سے پندرہ بیس یوم قبل مولانا کے عزیز ترین بھائی حسن احمد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم سے ان کو جو والہانہ محبت بلکہ عشق تھا اُس کی بنا پر میں نے خیال کیا کہ وفورِ غم کے باعث اس دفعہ وہ اجلاس میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ لہٰذا میں بڑی ہی بے کیفی کے عالم میں بریلی سے علی گڈھ روانہ ہوا، ۱۱ بجے رات کو سٹی اسکول پہنچا۔ کیونکہ مہمان وہیں ٹھہرائے گئے تھے۔ ایک کمرہ میں سامان رکھ کر امید و بیم کی حالت میں میں نے رضاکاروں سے پوچھا کہ کیا مولانا صاحب بھی آئے ہیں۔ اُن لوگوں نے جواب دیا جی ہاں! آج صبح ہی تشریف لائے ہیں۔ یہ معلوم ہوتے ہی میں اُن کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ اُس رات شب سخت بارش ہوئی تھی اور اسکول کمپاؤنڈ میں کانفرنس کا جو پنڈال بنایا گیا تھا وہ گر پڑا تھا جسے دن بھر دھوپ میں سکھانے کے بعد دوبارہ کھڑا کیا جا رہا تھا کافی مزدور اور کارکنان کانفرنس زمین میں کھونٹے گاڑنے اور اُن میں رسیاں باندھ کر شامیانوں کو کھڑا کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

اس ہنگامہ میں ایک طرف دیکھا تو مولانا بھی جھکے ہوئے کھونٹے گڑوا رہے ہیں۔ میں نے قریب جا کر زور سے السلام علیکم کہا جس پر پلٹ کر دیکھا فوراً

چہرہ پر بے پایاں شگفتگی چھاگئی اور مجھے زور سے سینہ سے لگالیا۔ اور فرمایا۔
"اُخوہ! خوب آئے" میں نے عرض کیا۔ میرے آنے کی ایسی کیا اہمیت ہے۔
کمال تو آپ نے کیا کہ ایسے زبردست حادثہ کے بعد آپ کانفرنس میں تشریف لائے
اور اس قدر انہماک کے ساتھ کام میں لگے ہوئے ہیں، کہنے لگے صدمات اور حا
کا علاج ہی یہ ہے کہ آدمی فوراً کام میں لگ جائے اور دل و دماغ کو فرصت ہی
نہ دے کہ وہ پچھلی باتوں کو سوچے اور اپنی صلاحیتوں کو جو قدرت کی طرف سے
ایک امانت ہیں زائل کرے۔ دوسرے قومی کام کو تو ریل گاڑی کی طرح چلتا
رہنا چاہئے۔ لوگ مرتے کھپتے رہتے ہیں لیکن مقررہ ٹائم ٹیبل کے مطابق ریل
چلتی رہتی ہے۔ دوسرے دن سے کانفرنس کے اجلاس ہوئے اور مولانا
نے تین روز مسلسل ایسے جوش و خروش سے اس میں حصہ لیا جیسے کہ کوئی بات ہی
نہ ہوئی ہو، سچ ہے! ؎

اگر تم دیکھ سکتے ہو وہ قصرِ آرزو گرتے — بنائے ہیں جسے تم نے گزاری زندگی سا
اور اس پر بھی خدا کا نام لے کر اٹھ کھڑے ہو تم — اور اپنے کہنہ اوزاروں سے ہو مصروف معما
اگر تم اپنی سب جیتی ہوئی پونجی کو بے کھٹکے — اٹھا قسمت کی بازی پر لگا سکتے ہو اک با
اور اس کو ہار جاؤ پھر بھی کوشش سے نہ باز آؤ — نہ اس نقصان پر نکلے تمہارے لب سے
اگر تم کر سکو جبر اپنے دل اپنے رگ و پے پر — کہ کردیں حق ادا خدمت کا گو خدمت کے ہوں

تو تم روئے زمیں کی سلطنت پانے کے قابل ہو
اور اس سے بڑھ کے یہ تم مرد کہلانے کے قابل ہو

(سید حمید کاظمی۔ ترجمہ IF)

قومی و تعلیمی خدمت گزاری کے سلسلے میں مولانا صاحب کے ہمراہ برصغیر پاک و
ہند کے طول و عرض میں میں نے بکثرت سفر کئے۔ جس مقام پر جانا ہوتا ریلوے
ٹائم ٹیبل سے جانے آنے کی مختلف ٹرینوں کے اوقات کا تیسرے درجہ سے سکنڈ
کلاس تک کا کرایہ ریل۔ بڑے بڑے اسٹیشنوں پر گاڑی پہنچنے کے اوقات اور مثل
اس کے دوسری ضروری معلومات ایک علیحدہ کاغذ پر نوٹ کر کے فوری ضرورت
کے لئے شیروانی کی اوپر کی جیب میں رکھ لیتے تھے۔

زیر تصنیف کتاب کی کتب حوالجات تراشے، یادداشتیں۔ کافی مقدار میں سادہ
کاغذ کئی کئی فونٹین پن۔ غرض لکھنے پڑھنے کے جملہ لوازمات کپڑوں کے بکس میں بڑے
اہتمام سے رکھتے۔ بستر بند میں اوڑھنے بچھانے کے سامان کے علاوہ اپنی دلچسپی
کے مضامین "تاریخ و سیاست اور تعلیم و معاشیات پر مطالعہ کے لئے جدید ترین
مطبوعات باندھ لیتے۔ ایک بڑی سی سربند کنڈیا ہوتی جس میں لوٹا، گلاس
ناشتہ دان میں ڈبل روٹی۔ مکھن۔ دودھ اور شکر کے ڈبے اور پھل۔ ضروری
ادویات اور مٹی کے تیل کا ایک چھوٹا سا چولھا ہوتا۔ سفر خرچ کی رقم کے ساتھ
دس بیس روپے کی چھوٹی ریزگاری پیسے۔ اکنیاں۔ دونیاں۔ چونیاں
اور اٹھنیاں بٹوے میں ضرور ہوتیں۔ ان کے ماسوا بغل میں چھتری،
کاندھے پر بڑا رومال۔ ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں ایک چھوٹا
بستہ ہوتا۔ اسٹیشن ہمیشہ وقت سے کچھ پہلے پہنچتے۔ ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم
پر آتے اور قلی سے ایسی جگہ سامان رکھواتے جہاں بھیڑ بھاڑ نہ ہوتی اور سکون
ہوتا۔ اس کے بعد گھڑی نکال کر دیکھتے اگر ٹرین کے آنے میں دس منٹ بھی باقی

ہوتے تو کمبل کو جو بستر بند سے علیحدہ رکھا جاتا تھا فوراً زمین پر دوہرا بچھا کر بیٹھ جاتے اور اپنا سفری بستہ کھول کر جواب طلب خطوط کے جواب لکھنا شروع کر دیتے، ادھر ٹرین کی آمد آمد ہوئی اور اُنھوں نے اس عرصہ میں چار پانچ کارڈ لکھ کر پوسٹ بکس میں ڈال دیئے اور ٹرین میں سوار ہو گئے۔ اگر ریل کا ٹکٹ سکنڈ کلاس کا ہوتا اور سیٹ ریزرو نہ ہوتی تو وہ انٹر میں بلکہ تھرڈ کلاس تک میں آرام سے بیٹھنے لیٹنے کی جگہ دیکھتے تو اُس میں چلے جاتے۔ فرماتے کہ مقصد تو آرام سے سفر کرنا ہے نہ کہ شان دکھانا۔

ریل کے ڈبہ میں داخل ہوتے ہی وہ سیٹ پر اپنا بستر بند کھولتے۔ نصف بچھاتے نصف کا گاؤ تکیہ بنا لیتے۔ پھر تصنیف و تالیف کا بستہ کھلتا بکس میں سے ضروری کتابیں نکالی جاتیں اور بالکل یکسو ہو کر بڑے اطمینان سے لکھنا پڑھنا شروع کر دیتے، میں یا کوئی اور ساتھ ہوتا تو اُس کو مسودے صاف کرنے کو دیدیتے۔ یا ترجمہ کرنا ہوتا تو اس کا املا لکھوانا شروع کر دیتے لیکن انٹر اور تھرڈ کلاس میں من ملنے طریقے پر لیٹے یا بیٹھے رہنا اِلّا اس کے کہ تُند خوئی اور لتاڑ دکی سے کام لیا جائے آسان نہیں ہوتا۔ ہر اسٹیشن پر اگر پانچ آدمی کم ہوتے تو اُن کی جگہ دس اور آجاتے۔ ایسے میں مولانا اپنے تصنیفی کاروبار کو نوواردوں کو تکلیف و تکلّف میں مبتلا دیکھ کر پوری خوش دلی کے ساتھ سمیٹنا اور مختصر کرنا شروع کر دیتے۔ کتابوں کو اُٹھا کر بکس میں رکھ دیا اور کسی کو جگہ دے دی، پھیلے ہوئے بستر کو ایک پلٹا دے کر دوسرے کو بٹھا لیا، بستر کو تیسرا بل دے کر تیسرے کو

بیٹھنے کا موقع دے دیا، ضرورت پھر بھی باقی رہی تو پورے بستر کو سمیٹ دیا اور بالکل کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئے۔ اور جب وہاں بھی مفر کی صورت نہ ملی تو بستر کو نیچے رکھ کر خود اُس پر بیٹھ گئے اور اپنی آخری پناہ گاہ بھی کسی حاجتمند کے حوالہ کر دی۔ اس حال میں لکھنا ناممکن ہو جاتا تو وہ کتاب ہاتھ میں لے کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ مولانا کے اس ایثار اور شرافت کا قدرتاً ڈبہ میں ہر شخص کو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگتا۔ ایک دوسرے سے ہمدردی اور رکھ رکھاؤ کی فضا پیدا ہو جاتی۔ مولانا کی دی ہوئی جگہ پر بیٹھنے والے جب ریل سے اُترنے لگتے تو مولانا کا شکریہ ادا کرتے۔ اُن کے بستر کو اپنے ہاتھ سے دوبارہ بچھا دیتے اور آئندہ تعلقات قائم رکھنے کے لئے اُن کا پتہ نوٹ کر لیتے ــــ غرض مولانا کا پورا سفر اسی طرح علمی مصروفیت اور عملی درسِ ایثار و اخلاق میں گذر جاتا سفر ختم ہونے پر منزل مقصود پر پہنچتے اور اُن کے میزبان اگر متوسط الحال ہوتے۔ قیام کی جگہ ناکافی اور محدود ہوتی تو مولانا ٹھہرنے کے کمرہ میں کسی ایسے گوشہ کو تلاش کر لیتے جہاں سرہانے کی جانب بس روشنی اور ہوا مل جائے۔ دوسرے ساتھیوں کے پلنگ سے پلنگ بھڑے ہوئے ہیں لیکن وہ اپنی کتابوں اور لکھنے پڑھنے کے سامان کو سلیقہ سے ایک طرف لگا لیتے اور دیوار کے سہارے تکیہ لگا کر کام میں مصروف ہو جاتے۔ ملنے والوں سے ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ دُنیا جہان کے موضوعات پر باتیں ہو رہی ہیں۔ موقع موقع سے نہایت اچھوتی بزلہ سنجی ہو رہی ہے۔ اور بیچ بیچ میں قلم بھی چل رہا ہے ـــ

گنجے و ہمدمے و کتابے و خوردۂ ∴ از بہرِ ذوقِ نفس ز تاج و سریر بہ

مولانا کے یہ سارے دور و نزدیک کے سفر کسی اپنے ذاتی کام کے لئے نہ ہوتے تھے۔ بلکہ اُن کا عنوان قومی چلے۔ کانفرنسیں، تعلیمی اداروں کے قیام کی جدوجہد اور اُن کے زوال و انحطاط کی روک تھام کسی دوست، عزیز یا قومی و ملّی کارکن کی مصیبت میں ہاتھ بٹانے کی خاطر ہوتے تھے۔

کسی نے کسی ضرورت سے خط لکھ دیا اور مولانا اپنے ذاتی خرچ سے آمادۂ سفر ہو گئے۔

۱۹۲۶ء میں مولانا صاحب سب رجسٹراری کے عہدہ سے پنشن یاب ہوئے تھے۔ لیکن اس پیشہ میں ذاتی محنت و قابلیت اور دیانت داری کے باعث صوبۂ یو۔پی کے تمام سب رجسٹرار اُنھیں اپنا پیر مانتے تھے۔ ایک دفعہ لکھنؤ میں رجسٹراروں کی کانفرنس ہوئی جو صاحب صدر منتخب ہوئے وہ اپنا خطبۂ صدارت لکھنے سے معذور تھے۔ مولانا کو علیگڑھ تار دیا کہ فوراً آجائیے۔ ان دنوں مولانا سخت بیمار تھے، کئی ہفتہ سے پیچش کی شدید تکلیف نے آدھ موا کر دیا تھا۔ ہر چند ہم سب نے بالخصوص اُن کے رفیقِ خاص الخاص خان بہادر حاجی مولوی حبیب اللہ خاں صاحب نے منع کیا مگر مولانا نہ مانے۔ فرمایا!

"اسٹریچر منگا کر مجھے اسٹیشن پہنچا دو اور ریل میں لٹا دو وقت سے پہلے موت نہیں آئے گی۔ جو علاج یہاں ہو رہا ہے وہی لکھنؤ میں ہو جائے گا۔"

چنانچہ مولانا لکھنؤ گئے اور اپنے دوست کا خطبہ لکھا کر اور رجسٹراروں کی کانفرنس کامیاب کرا کر واپس آگئے ___ کسی کا خطبہ ہو۔ کسی کا نام ہو۔ مولانا کو اس سے غرض نہیں۔ اُنھیں تو کام سے کام اور وہ بھی جان پر کھیل کر۔

مولانا ہمیشہ سے کمزور صحت کے آدمی تھے۔ زندگی بھر بیماریوں سے لڑتے رہے۔ لیکن بیماری کی وجہ سے اُنھوں نے اپنے اوپر کبھی تعطل طاری نہ ہونے دیا۔ میں ایک سفر سے علی گڑھ واپس آکر اُن سے بعد مغرب "ولایت منزل" ملنے گیا تو دیکھا کہ کئی دن سے تپ و لرزہ کی شکایت میں مبتلا ہیں۔ اس وقت بھی کافی بخار تھا۔ یونیورسٹی کے ڈاکٹر ضیا من خاں صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا لحاف اوڑھے۔ کافی کرب و بے چینی میں مبتلا تھے۔ کوئی ۱۱ بجے رات تک میں بھی حاضر خدمت رہا اور جب دیکھا کہ خوب پسینہ آکر اُنھیں نیند آنے لگی ہے تو اُٹھ کر اپنے مکان چلا آیا ___

میں اپنے کانفرنس کمپاؤنڈ کے مکان میں ہمیشہ باہر کے کمرہ میں سویا کرتا تھا۔ دوسرے روز علی الصباح بے خبر پڑا سو رہا تھا کہ کسی نے کواڑوں کو کھٹکھٹایا میں نے بڑی ناگواری سے اُٹھ کر کواڑ کھولے۔ کیا دیکھتا ہوں مولانا کھڑے ہیں۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی اور میں نے عرض کیا کہ رات تو آپ کی اس قدر حالت خراب تھی یہ آپ نے کیا غضب کیا

کہ ایسی سردی میں آپ نکل آئے۔ فرمایا:

"میری طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے۔ آپ سے حالاتِ
سفر سننے کا اشتیاق تھا، دوسرے چہل قدمی بھی کرنی تھی۔"

میں نے کہا: "چہل قدمی! یا ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق
مکمل آرام۔"

بولے: "جی نہیں! طبیعت خود بتا دیتی ہے کہ لیٹے رہنا چاہیے
یا چلنا چاہیے۔ دوسرے گھر میں بستر پر مرنے سے سڑک پر گر کر
مرنا اچھا ہے۔"

مولانا ہر مرض کا علاج زیادہ سے زیادہ پیدل چلنے سے کیا کرتے
تھے اور اس پر نہایت پابندی سے عامل تھے۔

جس زمانہ کی میں بات کر رہا ہوں اُن کی عمر ۶۵ سال سے متجاوز
ہو چکی تھی اور صحت کی حالت میں اُن کا معمول تھا کہ اپنی ٹائم پیس میں الارم
لگا کر خواہ کتنی ہی سردی کیوں نہ ہو ٹھیک ۵ بجے بستر چھوڑ دیتے تھے
اور حوائج ضروری سے فارغ ہو کر شب میں رات کو بھرے ہوئے
ٹھنڈے باسی پانی سے غسل کرتے اور اس کے بعد ہوا خوری کے لئے
صبح اندھیرے نکل جاتے۔ یونیورسٹی سے دو میل دور پُرانے قلعہ تک کا
چکر لگاتے اور ساڑھے چھ بجے میرے غریب خانے پر آجاتے۔ میں بالعموم
اُس وقت سوتا ہوتا اور ان کے اُٹھانے سے ہی اُٹھتا تھا۔ دس پندرہ
منٹ مشترک دلچسپی کی باتیں ہوتیں اور دن بھر کے کاموں کا پروگرام بنتا

اس کے بعد وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور میرا یہ اخلاقی فرض ہوتا کہ میں اُن کو
اُن کی قیام گاہ "ولایت منزل" تک جو دو فرلانگ دور تھی پہونچانے جاتا۔
راستہ میں جو موضوع سخن چھڑ جاتا تھا وہ اگر ختم نہ ہوتا تو ولایت منزل کی پُلیہ پر
بیٹھ کر باتیں ہوتیں۔ میں رخصت ہوتا تو مولانا پھر کوئی مفید و دلچسپ سلسلۂ
کلام شروع کر کے میرے ساتھ ہو لیتے اور مجھے گھر تک پہنچاتے، اُس وقت مجھے
احساس ہوتا کہ مولانا نے تو میری خاطر دو چکر لگائے اور میں اُنھیں واپسی
میں اکیلا چھوڑ دوں لہٰذا میں دوبارہ اُن کے ساتھ ہو لیتا اور انھیں
ولایت منزل تک چھوڑ کر چلا آتا۔ اب میں غور کرتا ہوں تو خیال ہوتا ہے
کہ میری لاعلاج کاہلی اور دیر سے اُٹھنے کی عادت ترک کرانے کے لئے مولانا
یہ سب کچھ کیا کرتے تھے تاکہ اور کچھ نہیں تو ولایت منزل تک کے ہی
دو چکر لگوا دیں۔

جتنے دن مولانا علی گڑھ رہتے اُن کی اس زحمت فرمائی میں کبھی
فرق نہ آتا۔ لیکن دوسری طرف میرے ڈھیٹ پن کا یہ عالم کہ روز ہی تو
رات کو اس نیک ارادہ سے سوتا کہ صبح کو میں جاگتا ہوا ملوں مگر کبھی کامیابی
نہ ہوئی اور جب مولانا علی گڑھ سے تشریف لے جاتے تو پھر کیسی سحر خیزی
اور کیسے ولایت منزل کے دو چکر۔ کاش! کبھی بھولے سے بھی یہ خیال
آتا کہ ؎

خفتگان از زندگی آگہ نیند　　　زندہ بودن کارِ بیدارے بود

مولانا کو معلوم تھا کہ میں ضعفِ معدہ کا مریض ہوں اور اُس کی وجہ

سے کتنے دن بیمار پڑ جاتا ہوں جس کے لئے زیادہ سے زیادہ پیدل چلنا مفید تھا۔ لہٰذا جہاں تک اُن کا بس چلتا وہ مجھے پیدل چلواتے۔ دن میں یا شام کو جب بھی وہ میرے پاس آتے یا میں اُن کے پاس جاتا تو ضروری گفتگو کے بعد فوراً کہیں چلنے کا پروگرام بن جاتا ــــ اور میں اور وہ سڑک کے کنارے کنارے میانہ روی کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ شہر یا سول لائنس کا رُخ کر لیا اور چلچلاتی دھوپ اور لُو میں بھی جب تک حواس بالکل ساتھ نہ چھوڑ دیتے سواری نہ کی جاتی۔ اکثر واپسی کے وقت یکہ یا تانگہ البتہ کر لیا جاتا تھا۔

ایک دفعہ ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صاحب چیرمین جغرافیہ ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی جو بعد کو ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم یوپی اور کراچی یونیورسٹی کے نامور رجسٹرار ہوئے سخت بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹروں نے اختلاجِ قلب کا مرض تشخیص کیا اور چلنے پھرنے کی ممانعت کر دی۔

مولانا اُن کی عیادت کو گئے تو تفصیلی حالات دریافت کرنے کے بعد ڈاکٹروں کی رائے سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ دن رات دماغی کام کرنے اور کسی قسم کی جسمانی ورزش نہ کرنے کی وجہ سے ریاحی (گیسٹرک) تکلیف ہے جو علی الصباح کی سیر سے دور ہو جائے گی، ڈاکٹر خان کو دوا پینے سے نفرت تھی مولانا کا مشورہ قبول کر لیا اور وعدہ کیا کہ ٹہلنا شروع کر دیں گے لیکن مولانا جانتے تھے کہ کہنے اور کرنے میں کس قدر فرق ہے لہٰذا دوسرے دن علی الصباح ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچ گئے اور اُن کو سیر کرانے اپنے ساتھ لے گئے صرف ایک دن نہیں بلکہ تین ماہ مسلسل جب تک کہ

ڈاکٹر خان بالکل تندرست نہ ہو گئے اور صبح کی چہل قدمی کے عادی نہ ہو گئے۔

مولانا کو بیماروں سے خاص ہمدردی اور تیمارداری سے خاص شغف تھا، دوست احباب عزیز و اقارب۔ جان پہچان کا غرض کوئی ہو ذرا اُس کو تکلیف ہوئی اور وہ اُس کی تیمارداری میں لگ گئے۔ ایک مرتبہ اُن کے نواسے عزیزی جمیل احمد کاظمی ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوئے۔ اُن دنوں مولانا اپنے مکان منگلوری میں تشریف فرما تھے بڑا ہی مشغول پروگرام تھا۔ کئی جگہ اُنھیں باہر جانا تھا۔ لیکن جمیل میاں کی وجہ سے سارے پروگرام ملتوی کر دیئے اور جب تک اُن کو صحت نہ ہو گئی باہر نہ گئے۔ پابندیِ وقت سے دوائیں دیتے۔ ٹمپریچر لیتے۔ ڈاکٹر کو دکھاتے۔ نہلاتے دُھلاتے۔ کپڑے تبدیل کراتے۔ کھانے پینے کا اہتمام کرتے۔ غرض ایک عمدہ تیماردار کو ایک بیمار کے لئے جو کچھ کرنا چاہئے وہ سب کچھ کرتے۔ اس کے یہ معنی نہ تھے کہ کوئی دوسرا تیماردار نہ تھا۔ جمیل میاں کے والد اور گھر کے دوسرے لوگ موجود تھے مگر مولانا ہر کام کے لئے اوروں سے فرماتے کہ یہ تو میں کر لوں گا۔ تم فلاں کام کرو۔ اور ساتھ کے ساتھ یہ کوشش کرتے کہ اُن کے اپنے معمولات میں بھی کوئی فرق نہ آئے[۱]

اس سلسلے میں خود مجھے اپنا واقعہ یاد آیا کہ میں مولانا صاحب کے ہمراہ آگرہ ہوٹل

---

[۱] مضمون سید امداد حسین کاظمی۔ طفیل نمبر ذوالقرنین بدایوں۔ مئی ۱۹۴۶ء

واقع دریا گنج دہلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ کمرہ جس میں ہم ٹھہرائے گئے۔ لب سڑک تھا، ساری رات کمرے کے پاس سے لاتعداد تانگے گزرتے رہے جس کی وجہ سے ایک منٹ کو نیند نہ آئی اور مجھے صبح ہوتے ہوتے بڑے زور کا انفلوئنزا ہو گیا۔ سہ پہر تک تکلیف کافی بڑھ گئی۔ مولانا برابر میری حالت دیکھ رہے تھے فرمایا: "آپ کو نزلہ بے خوابی کے علاوہ قبض اور پیٹ کی خرابی کی وجہ سے بھی ہوا ہے۔ آپ انیما لے لیں۔" میں نے عرض کیا کہ میں نے تو کبھی زندگی بھر انیما نہیں لیا۔ دوسرے اس سفر کی حالت میں یہ جھنجھٹ کون مول لے۔ بولے یہ کیا دشوار ہے۔ جب تک پہلے پیٹ صاف نہ ہوگا کوئی دوا اثر نہ کرے گی اور پیٹ کی صفائی کے لئے داخلی دوا کے بجائے جو کمزور کر دیتی ہے۔ ہمیشہ انیما لینا چاہئے۔ اس کے بعد انیما کی تاریخ۔ جس کو حکیم جالینوس نے ایجاد کیا تھا اُس کے فوائد نیز طریقۂ استعمال پر تفصیلی تقریر فرمائی۔ پھر ارشاد ہوا: "اچھا اب اُٹھو! انیما کین (برتن) خرید لائیں۔ چنانچہ مجھے چاندنی چوک نوٹرودم کے پاس بازار لے گئے۔ انیما کا سامان خرید کر ہوٹل واپس آکر مجھے غسل خانہ میں داخل کر دیا اور خود دروازے کے باہر کھڑے ہو کر ہدایت دیتے رہے۔ اس عمل سے مولانا کے ارشاد کے بموجب سارا وبال پیٹ سے نکل گیا اور میری طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔

اچھی صحت کے لئے چہل قدمی کی طرح مولانا کو انیما پر بھی حد درجہ یقین تھا۔ چنانچہ سفر و حضر میں انیما کا سامان زندگی بھر اُن کے ساتھ رہا اور کیسی ہی بے ٹھکانا جگہ ہو وہ اُس کے استعمال کی کوئی نہ کوئی صورت

نکال لیتے۔ مثلاً ایک بار پہلی بجیت میں سخت سردی کے موسم میں شہر سے باہر دریائے گھاگرا کے کنارے صوبائی تعلیمی کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سلسلہ میں جو ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، خیمہ زن تھے، اور اس جگہ بد قسمتی سے ہم لوگ حوائج ضروری کی مناسب سہولتوں سے محروم تھے۔ ایک روز رات کو مولانا کے پیٹ میں درد ہوا۔ لمحہ بہ لمحہ تکلیف میں اضافہ ہونے لگا۔ میں کوئی دوا حاصل کرنے کی فکر کرنے لگا تو فرمایا: "دوا سے کام نہ چلے گا انیما مفید ہوگا۔"

میں نے عرض کیا کہ خیمہ میں دوسرے ساتھیوں کی وجہ سے کوئی ٹھکانا نہیں اور باہر تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے فرمایا: "المونیم کے ناشتہ دان میں تین ڈبے ہیں۔ دو ڈبوں کا چولھا بنا لو۔ ایک ڈبے میں پانی رکھو اور اخبار جلا کر اُسے گرم کر لو۔ جب پانی گرم کر کے اور اُس میں صابن گھول کر میں نے انیما کین تیار کر لیا تو فرمایا ایک لحاف اُٹھا لو اور باہر میدان میں میرے ساتھ چل کر ہوا سے بچنے کے لئے اُس کی آڑ بار کر دو۔ لیجئے اس طرح عارضی طہارت خانہ بن گیا۔ اور مولانا نے انیما لے کر اپنی طبیعت کو ٹھیک کر لیا۔ مولانا صاحب کی تقلید میں برسہا برس میں نے انیما کا استعمال جاری رکھا۔ جس کی بدولت میری صحت بالعموم اچھی رہی۔ اب کراچی آکر انیما کی افادیت کا قائل ہونے کے باوجود اُس کا تارک ہو گیا ہوں اور آئے دن بیمار رہتا ہوں، پابندی کے ساتھ صبح کی سیر اور کم از کم آٹھویں دن انیما کو اپنا معمول بنا لوں تو پھر سے نئی زندگی مل سکتی ہے۔ مگر کیا کیا جائے ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کاش! میرے لئے مولانا سید طفیل احمد صاحب آج بھی موجود ہوتے۔

مولانا سید طفیل احمد صاحب سادہ لباس، سادی جلتی رہائش۔ اور سادہ خوراک کے عادی تھے۔ لباس میں ہر چیز دیسی کپڑے کی ہوتی۔ اونچی باڑ کی سفید دو پلی ٹوپی، ہلکے کتھئی یا کسی اور رنگ کی شیروانی، ٹخنوں سے اونچا علی گڑھ کٹ کا پاجامہ۔ کاندھے پر زرد رنگ کا رومال۔ پاؤں میں براؤن رنگ کی گرگابی۔ بڑی بڑی جاذب توجہ آنکھوں پر رنگین چشمہ کشیدہ قامت کھلتا ہوا گندمی رنگ قدرے دراز سپید داڑھی اور چہرہ پر شگفتگی۔ شرافت اور منکسرانہ متانت۔ جسم صاف۔ کپڑے صاف اور دل و دماغ صاف کھلی فضا کے دلدادہ اپنے وطن رڑکی میں منگلور، روڈ پر نہر کے کنارے کنارے اُن کا چالیس بیگھے کا عریض و طویل باغ اور کوٹھی اور خاص قصبۂ منگلور میں کشادہ مردانہ دیوان خانہ اور زنانہ محل سرائے۔ ہر کمرہ روشن اور ہوادار کتنی ہی سردی ہو جب رات کو سوتے تو کمرہ کی کھڑکیاں کھلی رکھتے۔ حالت سفر میں اگر کسی بڑے آدمی کے یہاں قیام کرنا پڑتا تو ٹھہرنے کے کمرے میں دروازوں اور کھڑکیوں کے پردوں۔ زمین پر قیمتی قالینوں، مکلف صوفوں اور اونچی اونچی بھاری گدّوں کی مسہریوں سے اُن کو سخت وحشت ہوتی، اُن کا دم گھٹنے لگتا۔ اور وہ چند روز ہی میں بیمار پڑ جاتے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کلکتہ کے موقع پر دوسرے مشاہیر کے ساتھ امیر کبیر مولوی محمد امین صاحب

تاجر چرم نے اپنی انتہائی قیمتی سامان سے مزین کوٹھی میں اُن کو مہمان بنایا تو وہ تین ہی دن میں گھبرا گئے اور مجھے بلا کر فرمایا کہ بھئی خدا کے لئے مجھے یہاں سے نکالو میری بہت بری حالت ہے۔ چنانچہ میں اُنھیں فوراً اپنے عم محترم سید شوکت علی صاحب انجینیر کے مکان واقع پارک سرکس میں لے گیا جہاں اگرچہ جگہ کی شدید قلت تھی لیکن ہمارے کمرے میں دھوپ اور تازہ ہوا کی نعمت بدرجہ اتم موجود تھی۔ مولانا وہاں آکر بہت خوش ہوئے اور بولے کہ اس جگہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے برف کی سِل میرے سینے پر سے اُتر گئی۔ اسی طرح ۱۹۴۰ء میں ہم لوگ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس پونا میں شرکت کے لئے گئے تو صدر مجلس استقبالیہ مسٹر احمد، ای۔ ایچ جعفر نے ہم لوگوں کو اپنے مشہور جعفر چیمبر کے مہمان خانہ میں ٹھہرایا جو حسب معمول پر تکلف سامانِ رہائش سے مملو اور چاروں طرف اونچی اونچی عمارتوں سے گھرا ہوا تھا۔ مولانا صاحب اُس میں داخل ہوتے ہی فوراً باہر نکل آئے اور پریشانی میں ٹہلنے لگے میں اُن کی بے چینی کی وجہ سمجھ گیا اور میں نے بھاگ دوڑ کر کے مقام کانفرنس اینگلو اردو ہائی اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک سادہ سے کمرے میں جو ہر اعتبار سے روشن اور ہوادار تھا اپنے کو اور مولانا صاحب کو منتقل کر لیا۔

مولانا صاحب کو اکثر دیکھا کہ چہل قدمی کو گئے ہیں اور اگر تکان محسوس ہوئی تو کسی بھی کھلی زمین پر بے تکلف اپنا رومال بچھا کر لیٹ جاتے اور اس کا کچھ خیال نہ کرتے تھے کہ راستہ چلنے والے انھیں اس طرح پڑے ہوئے دیکھ کر کیا خیال کریں گے۔ مولانا صاحب دُنیوی وجاہت کے اعتبار سے خاندانی

رئیس تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہوکر یوپی کی صوبائی مجلس قانون ساز کے ممبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ اور اگزیکیوٹو کونسل کے ممبر — آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے وائس پریسیڈنٹ ۱۹۳۵ء سے پہلے آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر، مسلمانوں کی تمام قومی و ملی تحریکات کے بطل جلیل اور اپنے خلوص کے باعث مشاہیر ملک کی آنکھ کا تارا ہونے کے باوجود اپنی سادگی و پرکاری میں ہی مست و مگن رہتے تھے۔ کہتے تھے کہ

"میں عقیدۃً تو نہیں عملاً کمیونسٹ ہوں۔"

انھوں نے عمدہ لباس۔ شاندار سواری اور وجاہت ظاہری کے دوسرے تمام اسباب سے اپنے کو آزاد کرکے عوامی خدمت کے لئے ایک خالص عوامی انسان بنالیا تھا۔ اس قسم کے میں نے دو ہی آدمی دیکھے ایک مولانا حسرت موہانی اور دوسرے مولوی سید طفیل احمد منگلوری (علیگ)

---

۳۰ مارچ ۱۹۴۶ء کو ۷ بجکر ۲۰ منٹ پر مولانا کا انتقال ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ کانی جنئے۔ آخر ایک دن مرنا تھا لیکن یہ روح پرور ہوا اور جاں بخش سورج کی روشنی بھی تو ہزاروں سال بوڑھی ہے کیا ان کا رک جانا اور بند ہو جانا کوئی گوارا کرے گا۔ آفتاب عالم تاب ہر روز صبح سے شام تک اپنی صحت بخش نور پاشی سے دنیا کا کاروبار چلانے میں ناگزیر مدد دیتا ہے۔ لیکن مصروفیت کار میں نہ کبھی اس کا ذکر کیا جاتا ہے اور نہ اس کا شکر۔

چھوٹے چھوٹے گوالف و حوادث ہمیں گھنٹوں مصروف ذکر و فکر رکھتے ہیں

لیکن وہ خاص سرچشمۂ حیات اور محرک کار کبھی زیر غور یا معرض گفتگو میں نہیں آتا جس کے بغیر نہ ہمیں کام کرنے کی اُمنگ ہوسکتی ہے اور نہ ہم کوئی کام کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ ایک انتہا درجہ قیمتی اور ضروری چیز کی بہتات طبیعت میں مساوات کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اس کا 'وجود' ہماری رگ و پے میں کچھ اس قدر بس جاتا ہے کہ اُس کے 'عدم' کا خیال ہی حیطۂ تصور میں نہیں آتا۔ لیکن فرض کرو کہ ہماری زندگی میں ایک نامبارک صبح ایسی آئے کہ اُس روز فضائے آسمانی پر سورج نمودار نہ ہو ساتھ ہی یہ بھی بتا یا جائے کہ اب وہ کبھی نہ نکلے گا۔ تو بتاؤ کہ کیسا کچھ ہنگامہ اور تلاطم برپا نہ ہوگا اور کیا تم یہ کہہ کر اپنے دل کو صبر دے لوگے کہ "آخر تابکے۔ ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔"

اپنی ذاتی اور قومی زندگی میں "مولانا" کے وجود باجود کو نادانی سے ہم کچھ ایسا لافانی اور مستقل سا خیال کئے ہوئے تھے۔ کہ کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہ کیا کہ "یہ جانے والے ہیں"۔

"مولانا" چلے گئے اور اب کبھی نہ آئیں گے۔ اس بات نے ایک ہیجان۔ ایک زبردست انتشار اور ایک حشر جذبات برپا کردیا ہے۔

ہماری رائے میں مولانا سید طفیل احمد صاحب بیسویں صدی عیسوی کے دوسرے جمال الدین افغانی تھے۔ بادی النظر میں ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو ہمارا یہ دعویٰ مبالغہ آمیز معلوم ہو لیکن جس وقت اُنکی تمام بلند پایہ تصانیف۔ جملہ متفرق مضامین و مقالات۔ تقاریر کی یادداشتیں اور اُن کی ذاتِ گرامی سے

فیض یافتہ تعلیمی و سیاسی اداروں کے ریکارڈ۔ نیز ہر مذہب و ملت کے لاکھوں
انسانوں کی فرداً فرداً اور اجتماعی حیثیت سے بے لوث و بے ریا خدمت گزاریوں
کی یادداشتیں فراہم ہوں گی تو پتہ چلے گا کہ کتنا بڑا حکیم وقت مفکر اور انقلابی
شخص ہمارے درمیان سے اُٹھ گیا۔

مولانا کی حد درجہ سادہ معاشرت اور غیر معمولی انکسار نے ہمیشہ اُن کے
کارناموں پر پردہ ڈالے رکھا۔ اُن کے ساتھ کام کرنے والے اور اُن کے قریب ترین
احباب و اعزا بھی صرف انھیں کاموں کو جانتے تھے جو مخصوص اُن سے متعلق ہوتے
تھے۔ مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کے سارے گوشوں اور تمام پہلوؤں کی کسی کو
خبر نہیں ہے۔

مولانا طفیل احمد صاحب کی زندگی کا ایک مشن تھا جو ابتداً تعلیمی اور اصلاحی
اُس کے بعد اقتصادی اور آخر میں خالص سیاسی خدمات کی شکل میں ظاہر ہوا۔
اُن کی شخصیت نے اسی مشن کے تحت مختلف ارتقائی شکلیں اختیار کیں۔ اور مقام مسرت ہے
کہ وہ ہر دور میں بدرجۂ اتم کامیاب ہوئے اور اُنھوں نے اپنی آنکھ سے وہ تمام
تبدیلیاں اور انقلابات دیکھ لیے جن کے وہ دل سے آرزومند اور جن کی دُھن میں
وہ انتہا درجہ صبر آزما استقلال کے ساتھ دن رات لگے رہتے تھے۔

اُن کی انفرادی، جماعتی تنظیمیں تعلیمی، اصلاحی اور اقتصادی خدمتیں بڑے
سے بڑے نقصانات اور صدمات کو خاطر میں نہ لانا۔ اور بڑی سی بڑی خوشی کے موقع
اظہار مسرت میں اعتدال و متانت، اپنی اور دوسروں کی صحت و تندرستی کی فکر۔

ادنےٰ اور اعلیٰ ہر مسلمان اور انسان کی ذہنی، دماغی اور روحانی، صلاحیتوں کو اُبھارنے
کی دُھن۔ ایک اور صرف ایک ہی خیال کے ماتحت تھی کہ اُن کی قوم اُن تمام خوبیوں
اور محاسن کی حامل ہو جائے جن کی بدولت دوسری ترقی یافتہ قوموں نے عروج
واقبال کی منزلیں طے کر کے لیلائے آزادی سے ہمکناری حاصل کی ہے۔

مولانا خود اپنے کو کبھی نہ دیکھتے تھے۔ صرف اپنی جد و جہد کے نتائج و اثرات
اور ثمرات کو دیکھتے تھے۔ ملکی آزادی اور قومی فلاح و بہبود کی اُنھوں نے ایک
عظیم الشان عمارت تعمیر کی جس کی وہ خود بنیاد تھے جو آج آنکھوں سے اوجھل خاموشی
کے ساتھ زمین کے نیچے دفن ہے۔ جسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اوپر کے خوشنما
دیوار و در اور دوسرا سامانِ آرائش البتہ سب کے سامنے ہے اور صرف
اُسی کی تعریف ہوتی ہے۔ مولانا نے ہمیشہ قومی اجتماعات میں خود سب
کام کیا لیکن جب پنڈال اور ڈائس سج سجا کر تیار ہو گیا تو نمود و نمائش
کی تمام نشستوں پر دوسروں کو بٹھا کر آپ سب سے پچھلی صف میں
جا کھڑے ہو گئے۔ آج دنیا شہرت و ناموری اور صلۂ خدمات کے لئے
جان کھوتی ہے لیکن ہمارے مولانا اس چیز سے قطعاً بے نیاز بلکہ
متنفر تھے۔ اس عادت کو فطرت ثانیہ بنانے کے لئے اُنھوں نے
کیسا کچھ جہاد نفس نہ کیا ہوگا۔ اوّل نمبر کے سردار اور جنرل ہونے
کے باوجود عمر بھر اپنے ہی بڑھائے ہوئے دوسرے قومی
کارکنوں کی ماتحتی میں کام کرتے رہے۔ کسی ذہنی غلامی یا پستی
کے سبب سے نہیں بلکہ انتہائے فراخ حوصلگی اور عالی ظرفی کی وجہ

سے۔ دوسروں کے بڑے بڑے جلوس نکالے جشن منائے اور شاندار تعزیتی جلسے کئے۔ اور خود صرف ایک ادنیٰ رہرو راہِ محبت بنے رہے حتیٰ کہ اپنے انتقال کا بھی کوئی ہنگامہ نہ ہونے دیا۔ علالت نے ترقی کی تو چپ چاپ اپنے دیہاتی وطن منگلور چلے گئے اور وہیں کی خاموش فضا میں سپرد خاک ہو گئے ؎

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی

۱۹۶۲ء

گرچہ یاراں غافل اند از یادِ من
از من ایشاں راہزاراں یاد باد

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی کا طویل علالت کے بعد ۱۸ اپریل ۱۹۶۲ء بروز چہار شنبہ بارہ بجکر ۲۵ منٹ پر مرحوم کے بڑے صاحبزادے مسٹر احمد صوفی کے بنگلہ ۲۲ سی گارڈن روڈ کراچی میں انتقال ہوا۔ اس عظیم علمی شخصیت اور نمونہ کے شریف و صاحب کردار انسان کے مرنے کا ملک کے اخبارات و رسائل اور علمی و تعلیمی حلقوں یا عام پبلک نے اس قدر کم نوٹس لیا کہ وہ نہ لینے کے برابر ہے۔ اور اسی لئے ہم اُن کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے لکھ رہے ہیں۔ اگر صوفی صاحب کوئی بڑے سرمایہ دار، سیاسی لیڈر یا پرانے سر، ہوتے تو ملک کے طول و عرض میں صف ماتم بچھ جاتی۔ اخبارات و رسائل سیاہ جدولوں کے ساتھ حالاتِ زندگی چھاپتے۔ تعزیتی اداریئے لکھتے۔ اظہار غم کے جلسے ہوتے اور خدا معلوم کیا کیا ہوتا۔

مستثنیات سے قطع نظر۔ عام طور پر جن لوگوں کے لئے یہ کام ہوتے ہیں وہ حقیقتاً اس قدر بڑے نہیں ہوتے جس قدر کہ عرفِ عام میں

انھیں سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے صوفی صاحب واقعی بڑے آدمی تھے اور اتنے بڑے کہ دُنیا ان کی بڑائی کا اندازہ لگانے سے قاصر رہی۔ وہ وقت سے آگے کے انسان تھے۔ بہر حال! ایک دن اُنھیں مرنا تو تھا ہی لیجئے وہ سچ مچ مر گئے ؎

رفتیم یاراں! تخفیفِ تصدیع
گر دردِ سر بود از ما شمارا

کوئی بھی علمی و تعلیمی کام یا اجتماع ہو مرحوم کی وجاہت ظاہری و باطنی سے مرصّع اور شگفتہ شخصیت صفِ اوّل میں نظر آتی تھی۔ رشک و رقابت۔ حرص و آز اور نمود و نمائش سے الگ تھلگ۔ خالص علمی و قومی جذبہ میں سرشار ہر کس و ناکس سے اخلاص و انکسار، خوش خلقی۔ تواضع اور بے لوث محبّت سے پیش آنا۔ گرتوں کو سنبھالنا پست ہمتوں کو بلند ہمّت بنانا۔ ہونہار نوجوانوں میں ذوقِ علمی پیدا کرنا۔ ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرنا۔ غرض صوفی صاحب کے وجود با جود کو خیر مجسم کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔

ڈاکٹر صوفی صاحب سے راقم کے تعلقات کی ابتدا ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے وہ پُرانے ممبر تھے۔ اور اس سلسلہ میں اُن کے جو خطوط آتے ان میں کچھ عجیب دلکشی ہوتی۔ نتیجہ میں روح پرور مراسلتی تعلقات میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ تاآنکہ ۱۹۳۶ء میں وہ دُنیا کا طویل علمی سفر ختم کر کے اپنے مستقر واپس آئے تو میں نے

اُن کو علی گڑھ تشریف لانے کی دعوت دی اور صدر دفترِ کانفرنس سلطان جہاں منزل کے ہال میں ان کا لکچر کرایا بالمشافہ ملاقات میں ہم لوگ ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ اور پھر صوفی صاحب کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں میں بجز خاص مجبوری کے پابندی سے شرکت فرمانے لگے۔ اور اپنے علم و فضل اور تعلیمی امور میں اپنی بصیرتِ تامّہ سے بیش قیمت رہنمائی فرمانے لگے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ ملک میں سیاسی افراتفری کا گزرا اور ع

کسے را با کسے کارے نہ باشد

کی بدولت صوفی صاحب سے تجدید ملاقات اُس وقت ہوئی جبکہ راقم نے ترکِ وطن کر کے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ اور اوائل ۱۹۵۱ء میں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ قدرتاً کانفرنس کے اربابِ دانش میں صوفی صاحب مقامِ رفیع کے مالک قرار دیئے گئے۔ مجلسِ عاملہ کے رُکن۔ شعبۂ تصنیف و تالیف کے صدر رہے اور ۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء تا ۱۷ جنوری ۱۹۶۱ء قابل فخر وائس پریسی ڈنٹ رہے۔

کانفرنس اور سر سیّد گرلس کالج نیز اُن سے متعلق تمام دوسرے شعبوں میں صوفی صاحب نے جس تندہی، ایثار۔ اور فہم و فراست سے کام کیا اُس کو اُن کے رفقائے کار کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

اسی طرح ملک کی آئندہ نسلیں۔ بالخصوص طبقۂ نسواں جس کی فلاح و بہبود اُن کو دل سے عزیز تھی اُنھیں ہمیشہ احسان مندی کے

ساتھ یاد کرے گا۔

پیدائش۔ خاندان اور تعلیم:۔

صوفی صاحب ۳۰ر جون ۱۸۸۶ء کو بروز چہار شنبہ بمقام امرتسر پیدا ہوئے آپ کا تعلق ایک قدیم اور نہایت معزز کشمیری خاندان سے تھا۔[1] ابتدائی مذہبی تعلیم گھر پر حاصل کر کے مقامی ایم اے او اسکول سے ۱۹۰۳ء میں مڈل اور ۱۹۰۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انٹرنس (میٹرک) پاس کیا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور علامہ عنایت اللہ مشرقی بھی آپ کے اسکول فیلو تھے۔ نیز سر سکندر حیات خاں کے بڑے بھائی غیرت حیات خاں مرحوم اُن کے ہم جماعت تھے۔

---

[1] امداد شاہ اپنی کتاب لب التواریخ میں لکھتا ہے کہ بارہ مولا (کشمیر) سے نیچے دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر کھکھا اور بمال کا علاقہ ہے۔ اس کا نام چیکارہ کھادرہ ہے۔ نیز اس خاندان کا حال کشمیر کے مشہور مورخ حسن شاہ نے اپنی ضخیم تاریخ کشمیر موسومہ تاریخ حسن میں وضاحت سے بیان کیا ہے کہ کھکھو اور ہاتھو ابتداءً ہندو راجپوت تھے مسلمان ہو کر کھکے خاں اور حاتم خاں کے نام سے موسوم ہوئے۔ سلطان زین العابدین خاں کے پاس ملازم ہوئے اور اس کو جب وہ تیمور شاہ کے ہاتھوں قید ہوا تو آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے۔ سلطان نے اس خدمت کے صلہ میں ان کو علاقہ کھادرہ میں جاگیر عطا کی۔ عہدِ افاغنہ میں ان کے وارثوں کی
(باقی فٹ نوٹ صفحہ ۲۳۱ پر)

ملازمت اور تحصیل علم

اسی سال صوفی صاحب کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور آپ کالج میں داخلہ لینے کے بجائے ملازمت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اوّلاً امرتسر کے انگریزی ہفتہ وار

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ گذشتہ ۲۳۰ کا)

جاگیر میں مزید اضافہ ہوا۔

خاندان کھکھا میں خواجہ عبد العزیز و خواجہ عبد الاحد مہاراجہ رنبیر سنگھ اور مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں بڑے نامی رئیس تھے۔ اسی خاندان کے ایک اور فرد خواجہ عبد الصمد گمرو بارہ مولا کے مشہور شاعر اور رئیس اعظم تھے۔ صوفی صاحب کے پردادا بدر الدین ہمتال قبیلہ سے تھے۔ دادا خیر الدین وکیل ریاست تھے اور مہاراج گنج سری نگر میں رہتے تھے۔ صوفی صاحب کے والد علی الدین صاحب نے شال۔ پشمینہ اور قالین کی تجارت شروع کی وہ فن نقاشی میں بھی کامل مہارت رکھتے تھے بڑے بزرگ عبادت گزار آدمی تھے۔ اپنی پہلی بیوی اور بچہ کے انتقال سے دل شکستہ ہو کر کشمیر کو خیر باد کہہ دیا۔ اور امرتسر میں سکونت پذیر ہو گئے۔ صوفی صاحب چوتھی بیوی سے پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا مرحوم جمال صاحب اور پرنانا کریم صاحب افغانی حکومت کے زمانے میں کشمیر کے صوبیدار عطا محمد خاں کے مخصوص سوداگرِ پشمینہ تھے۔ صوفی صاحب کے والد صاحب کا ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا اور والدہ صاحبہ نے ۳۱ر جنوری ۱۹۳۲ء کو بمقام جبلپور داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اخبار "خالصہ ایڈووکیٹ" ثانیاً کان پور کے اخبار "کان پور لوکل نیوز" ثالثاً لاہور کے "آبزرور" میں پروف ریڈر کا کام کرتے رہے۔ آبزرور کے ایڈیٹر شیخ عبدالعزیز بی۔اے تھے جن کے خاص احباب سر شیخ عبدالقادر، جسٹس شاہ دین اور سر میاں محمد شفیع مرحوم تھے۔ ان قابل ہستیوں کی صحبت کے اثر سے صوفی صاحب کو مزید تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا۔ لہٰذا ۱۹۰۸ء میں رسم شادی ادا کر کے آپ گورنمنٹ اینگلو اردو اسکول امراؤتی (برار) میں بحیثیت اسسٹنٹ ماسٹر چالیس (۴۰) روپے ماہوار تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ تاکہ تعلیمی لائن کی ملازمت کے ساتھ آئندہ اپنی تعلیم کو بھی جاری رکھ سکیں۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے، ایل۔ٹی ۱۹۲۰ء میں ایم۔اے ۱۹۳۵ء میں پیرس یونیورسٹی سے ڈی۔لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ مزید براں موصوف نے ۱۹۳۶ء میں دنیا کی مشہور درس گاہ ٹیچرس کالج کولمبیا یونیورسٹی۔ نیویارک (امریکہ) کے پوسٹ ڈاکٹرل ڈپارٹمنٹ میں متعدد ماہ گذارے۔

سی پی کے محکمۂ تعلیم کی ملازمت میں صوفی صاحب بر بنائے تدریجی تعلیمی ترقی اور عمدہ کارگذاری انسپکٹر آف اسکولس کے عہدہ تک پہنچے۔ یہی نہیں بلکہ جب دہلی یونیورسٹی قائم ہوئی تو ڈاکٹر صوفی صاحب اس کے پہلے رجسٹرار بنائے گئے اور اس عظیم دارالعلوم کی تاسیس و تعمیر میں انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔

فرائض ملازمت کی جانکاہیوں کے ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر صوفی زندگی بھر

ایک پُرمشقت طالب علم بنے رہے۔ مسلسل مطالعہ۔ اُن کا خاص مشغلۂ حیات تھا۔ محض دماغی عیاشی کے لئے نہیں۔ جیسا کہ آج کل اونچے تعلیم یافتہ لوگوں کا شعار ہے بلکہ علم حاصل کر کے تقریر و مذاکرہ اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ اس علم کو دوسروں تک پہنچانے کی غرض سے۔ لہٰذا برصغیر پاک و ہند میں ہزاروں علمی تقاریر اور سیکڑوں تحقیقی مقالات کے علاوہ ۱۹۵۴ء میں امریکن احبابِ شرق وسطےٰ کی دعوت پر آپ امریکہ تشریف لے گئے اور سارے ملک میں لکچر دیئے جن میں پاکستان کے متعلق خاص طور پر ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائیں، اُن کا یہ دورہ نہایت کامیاب رہا۔ واپسی میں لندن قیام کیا۔ اگلے سال دو صد سالہ مسلم عیسائی اتحاد کمیٹی" کے دعوت نامہ پر علمی و مذہبی مباحثوں میں حصہ لینے کے لئے پھر امریکہ گئے اور واپسی میں جامعہ اظہر قاہرہ میں عربی سیکھنے کے لئے داخلہ لے لیا۔ کئی ماہ وہاں قیام کرنے اور طلبِ علم کی تشنگی دور کرنے کے بعد دمشق اور سعودی عرب ہوتے ہوئے پاکستان لوٹے یہ مرحوم کا آخری بیرونی سفر تھا۔

ذوقِ سفر!

ڈاکٹر صاحب سیر و سیاحت کو زندگی کا ایک نہایت ضروری عنصر اور معلومات۔ تجربات۔ وسعت خیالی و ترقی حاصل کرنے کا اہم ذریعہ خیال کرتے تھے۔ آپ کہتے تھے کہ

> "ہر صاحبِ ذوق کو اپنی آمدنی میں سے کچھ روپیہ صرف اس لئے پس انداز کرنا چاہیے کہ سال میں کم از کم ایک مرتبہ کسی نئے مقام کے دیکھنے میں صرف کرے"۔

جب ڈاکٹر صاحب کی پروف ریڈری میں پچیس تیس روپئے ماہوار اور ابتدائے ملازمت اسسٹنٹ ٹیچری میں چالیس روپئے ماہوار آمدنی تھی تو اس میں سے بھی جس قدر ممکن ہوتا بچا کر سیر و سیاحت میں خرچ کرتے تھے۔ اور پھر جوں جوں آمدنی بڑھتی گئی۔ اسی تناسب سے اُن کے سفر کا بجٹ بڑھتا گیا۔ اس خرچ کے بارے میں اُن کا قول تھا کہ

"جب تک خود مجھے وسیع معلومات اور اعلےٰ تجربات حاصل نہ ہوں گے بچوں کی صحیح رہنمائی کس طرح کر سکوں گا؛ جوانی اور بڑھاپے پر کچھ منحصر نہیں۔ انسان کو اپنی عمر کا ہر حصّہ اعلےٰ مقصد کے لئے صرف کرنا چاہئے۔"

چنانچہ آسام کے علاوہ پاکستان اور ہندوستان کے تمام صوبوں اور برما سیلون۔ سعودی عرب۔ مصر۔ فلسطین۔ اٹلی۔ سوئیٹزرلینڈ۔ فرانس بیلجیم۔ جرمنی۔ انگلینڈ۔ امریکہ۔ کنیڈا۔ افغانستان۔ ایران۔ عراق۔ شام لبنان۔ ٹرکی۔ یونان۔ الجزائر۔ پرتگال۔ جاپان۔ چین۔ فلپائن۔ سنگاپور اور ملایا وغیرہ کا بار بار سفر کر کے عجائب و غرائبِ عالم کا خوب خوب مطالعہ کیا اور جو علم و تجربہ حاصل کیا اُس کو اپنے اہلِ ملک کی اصلاح و ترقی پر صرف کیا۔

۱۹ اپریل سنہ ۱۹۶۲ء کی سہ پہر کو اس آفتابِ علم کی کفن پوش میت سپردِ خاک کے جانے کے لئے جب کنارۂ قبر پر رکھی ہوئی تھی تو اُس کو

دیکھ کر جہاں ہمیں اور تاثرات ہوئے وہیں ان کی عالم نوردی کا بھی تصوّر بندھا اور ہماری زبان پر بہ تصرّفِ خفی غالبؔ کا یہ شعر آیا ؎

مرہم[1] کی جستجو میں پھرا ہے یہ دور دور
حد سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں

تصانیف

ڈاکٹر محی الدین صوفی اُردو۔ فارسی۔ عربی اور فرانسیسی کے علاوہ انگریزی زبان کے مسلم الثبوت ماہر تھے۔ اس زبان میں تقریر و تحریر پر بے پناہ قدرت تھی اور پھر مزید برآں اُن کی تحقیق و تدقیق اور لکھنے کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط نے اُن کو صحیح معنی میں ایک معیاری مصنّف بنا دیا تھا۔ اس بیان کی تائید میں آں مرحوم کا ایک خط جو اُنھوں نے جون سنہ ۱۹۴۴ء میں راقم کو لکھا تھا ملاحظہ ہو:۔

"عزیزم! میں نے ایک کتاب 'صغرا نامی' لکھی ہے اور اس کے صرف پچاس نسخے اس لئے طبع کرالئے ہیں کہ بعض اہل رائے حضرات سے تنقید حاصل کروں" اور بعدہٗ اس کو با قاعدہ طور پر طبع کراؤں۔ یہ کتاب چوں کہ مخصوص تعلیم پر ہے۔ اور محض زنانہ تعلیم پر جس میں تعلیم حال۔ ماضی و مستقبل۔ پردہ۔ جہیز۔ طلاق۔ ضبطِ تولید وغیرہ سب امور آجاتے ہیں۔ اس لئے مختلف طبائع اور مختلف الخیال

---

[1] یعنی علم

احباب واہل رائے حضرات سے استصواب رائے ضروری ہے اگر آپ اس امر کا وعدہ فرمائیں کہ علی گڑھ کے چیدہ حضرات کے نقطۂ نگاہ و تنقید سے مجھے استفادہ کا موقع نصیب ہو سکے گا تو ایک نسخہ روانہ کرتا ہوں، کتاب انگریزی میں ہے۔"

تو اس حزم و احتیاط سے لکھی ہوئی متعدد بلند پایہ کتابیں ڈاکٹر صاحب نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ صغریٰ کے علاوہ۔

(۲) "کشمیر" یہ عہد قدیم سے زمانۂ حال تک کی کشمیر کی تاریخ ہے۔ بڑے سائز پر بارہ سو صفحات کی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب آپ نے اُس وقت لکھنا شروع کی جب آپ دہلی یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے اور ۱۹۵۰ء میں اسے مکمل کر کے پنجاب یونیورسٹی کو بلا معاوضہ پیش کر دیا۔ جس نے اُسے سول ملٹری گزٹ پریس لاہور میں چھپوا کر اس کی چالیس روپئے قیمت مقرر کی۔ اس کتاب میں ایک سو سے زائد تاریخی نقشے اور تصاویر وغیرہ بھی شامل ہیں۔

(۳) "المنہاج" اس کا موضوع برصغیر پاک و ہند کے مسلم مدارس کا نصاب ہے۔ یہ فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی ہے۔

(۴) "کامن سینس آن پاکستان" ایک پمفلٹ ہے جو موصوف نے قیام پاکستان سے پہلے مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن بمبئی کو لکھ کر عنایت کیا جسے فروخت کر کے اُس نے اپنے فنڈ میں اضافہ کیا۔

(۵) "ثمرہ" عام خواتین کے بارے میں بالعموم اور مسلم خواتین کے

متعلق بالخصوص نہایت تفصیل سے ہر ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں "عورت کی حیثیت اسلام میں" اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

۲؎ کے ماسوا ڈاکٹر صاحب کی سب کتابیں انگریزی میں ہیں جن میں جدید ترین ہجا تلفظ اور اعراب (ٹرانس لی ٹریشن) کا خاص اہتمام کیا گیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح اونچے قسم کے یورپین مستشرق کیا کرتے ہیں۔

خاص میلان

صوفی صاحب کا خاص میلان تعلیم نسوان کی جانب تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ عورتوں کو مناسب اور اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رکھا جائے آپ اکثر ان کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے جو خواتین کے متعلق لکھی گئی تھیں۔ قرآن شریف اور احادیث سے نسوانی حقوق و فرائض کے اقتباسات نوٹ کرتے تھے اور نئے و نیز پرانے خیال کے علماء سے اکثر بحث کرتے تھے۔ دنیا کی مختلف اقوام کے طبقۂ نسواں کے مشاہدہ اور اسلامی تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ علم میں عورتوں کا پیچھے رہنا قوم میں کمزوری پیدا کرتا ہے۔

آپ نسوانی پردہ کو بھی جیسا کہ اب سے چند سال پہلے تک بھارت میں رائج تھا۔ تحصیل علم اور قومی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ اگر مرد اور عورتوں کی شروع ہی سے

بہترین اخلاقی تربیت ہو تو ان کا ساتھ ساتھ اور بے پردہ رہنا نقصان اور خرابی کا سبب نہ ہوگا اگر مرد اور عورت دونوں میں علمی اور عملی جدو جہد کا شوق پیدا ہو تو ایک دوسرے کے دوش بدوش رہ کر بھی پاک خیال رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ تعلیم نسواں کے متعلق اپنے نظریات کو فروغ دینے کے لئے وہ جہاں جہاں رہے عورتوں کی تعلیم گاہیں کھلواتے رہے۔ ہماری آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے قائم کردہ سر سید گرلز کالج سے بھی آپ کو اسی بناء پر بہت زیادہ شغف تھا۔

معاشرت اور اخلاق و عادات

ڈاکٹر صاحب کو صاف ستھرے انگریزی لباس۔ نفیس سامان بود و باند اور صحت پرور لذیذ کھانے پینے کی چیزوں کا بے خطا ذوق تھا۔ خوش رو خوش صحت اور چاق و چوبند شخصیت کے گرد ان چیزوں کا دل فریب منظر قابل دید ہوتا۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نہایت سرسبز و شاداب وادی کے پرسکون چشمۂ صافی میں کنول کا پھول کھلا ہوا ہو جس تیز قاعدہ کے صوفی صاحب تھے اسی کے ہو بہو نمونہ ان کی بیگم صاحبہ۔ صاحب زادے۔ صاحب زادی اور بہوئیں اور ان کے بچے الغرض صوفی صاحب کا مکان کسی بڑے جوہری کا نگار خانہ معلوم ہوتا تھا۔

صوفی صاحب کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ ٹیلی فون پر یا بالمشافہ ملاقات پر ایک پرجوش نعرۂ مسرت سے خیر مقدم کرتے اور پھر باتیں ایسی کہ کیسے ہی رنج یا غصہ کی حالت میں جاؤ تھوڑی دیر میں رنگ طبیعت ہی بدل جاتا۔ اکثر خیال

ہوتا کہ کیا کبھی صوفی صاحب کو غصہ بھی آتا ہے۔ کسی کو تنبیہہ بھی کرتے تو ہنستے ہنستے اور خوش گوار الفاظ میں، اس کے علاوہ وقت کی پابندی۔ محنت و مشقت کی عادت اور غربت میں بھی فراخ دلی اور دوسروں کی مدد کرنا اُن کا شیوہ تھا۔ جس زمانہ میں صوفی صاحب اُردو نارمل اسکول امراوتی برار کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ آپ نے اسکول کی کاپیوں پر مسدس حالی کا ایک بند چھپوا دیا تھا جو خود ان کی اپنی زندگی کا مستقل لائحہ عمل تھا۔

ہم مرد ہیں محنت سے کبھی جی نہ چرائیں | اوقاتِ معین میں ہر اک کام پر آئیں
بیکار نہ بیٹھیں، کبھی بیکار نہ جائیں | ہمت یہ رہے دوسروں کا ہاتھ بٹائیں

مفلس ہیں تو پروا نہیں ہمت ہے عالی
بلّور سے بہتر ہے مرا جام سفالی!

ڈاکٹر صاحب ایک اولوالعزم انسان تھے۔ ہر قسم کے مدارج علمی طے کرنے کے باوجود ان کو ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ؎

ہر چہ گیریم مختصر گیریم

فرماتے۔ جب میں نے ایم۔ اے پاس کیا تو سمجھا کہ ابھی پرائمری پاس کیا ہے جب ڈاکٹر آف لٹریچر ہوا تو سمجھا کہ اب انٹرنس پاس کیا ہے۔ اس کے بعد بھی میری تعلیم جاری رہی۔ سیاحت اور مطالعۂ مزید سے جب مجھے ایک حد تک مشاہدات و معلومات کے قابل استعداد حاصل ہو جائے گی تو یہ کہہ سکوں گا کہ اب گریجویٹ ہوا۔ ورنہ اب تک تو انڈر گریجویٹ یا بی اے فیل ہوں گے

اقوال صوفی صاحب سے کوئی ملاقات ایسی نہ ہوتی جس میں آپ اچھی اچھی نصیحتیں نہ فرماتے مثلاً آپ کا قول تھا کہ:-

(۱) کبر و غرور سے بہت سخت پرہیز چاہئے۔ اکڑنے اور اترانے والے کو جتنا جلد میں نے ٹھوکر کھاتے اور گرتے دیکھا ہے اور کسی کو نہیں دیکھا۔

(۲) ظلم و اذیت گو مظلوم و اذیت رسیدہ کو تھوڑی دیر کے لئے تکلیف دیں لیکن ظالم اور موذی کو اُس کا خمیازہ بُری طرح بھگتنا پڑے گا۔

(۳) سیاحت نہ صرف جذبۂ تعلیم و موجب توسیع خیال ہے بلکہ تازگی و بشاشت کا بھی سبب ہے۔

(۴) انسان اپنی صحت اُسی وقت قائم رکھ سکتا ہے جب وہ اپنے معدے پر قابو پالے۔

(۵) عورتوں کی تعلیم و تربیت اور صحت و حوصلہ مندی کے بغیر کسی قوم کا عروج ممکن نہیں۔

(۶) انسان اگر اپنے مولا کی یاد کا اور پیہم مصروفیت کا گُر پالے تو اُس نے بڑی دولت پالی۔

(۷) مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو اسی حالت میں پا سکتے ہیں جبکہ وہ سچی اسلامی تعلیم کا نمونہ بن جائیں۔

اولاد ایک حکیم کا قول ہے کہ اگر کسی گھر کی تہذیب دیکھنی ہو تو

اُس گھر کے بچوں اور بچیوں کو دیکھو۔ صوفی صاحب کے یہاں صاف اور خوبصورت بچے تو ہوتے ہی تھے اُن کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کے نتیجے میں خدا کے فضل و کرم سے ان کے تینوں صاحبزادے احمد محی الدین صوفی۔ محمود محی الدین صوفی۔ اور مسعود محی الدین صوفی نیز اُن کی صاحبزادی میمونہ سلطانہ صوفی اپنے اخلاق و کردار، اعلیٰ تعلیم و تہذیب کے اعتبار سے اچھے اور بہت اچھے لوگ ہیں۔ خصوصیت سے سب سے بڑے صاحب زادے مسٹر احمد صوفی اپنی عادات و خصائل میں صوفی صاحب کے سچے جانشین ہیں، اُنھوں نے مرحوم کی طویل اور انتہائی تکلیف دہ حالات میں حق خدمت بھی ایسا ادا کیا کہ اس کی اس زمانہ میں مثال ملنی مشکل ہے۔ اللہ ان کو دین و دنیا کی سرخروئی عطا فرمائے۔ اور وہ اپنے والد محترم کے نام نامی کو تا دیر روشن و تابناک رکھیں آمین[1]

---

[1] اس مقالہ کی تیاری میں مسٹر احمد محی الدین صوفی کی فراہم کردہ یادداشتوں اور جناب عبدالمجید دیوگاؤی کے ایک فاضلانہ مضمون سے جو رسالہ "بہارستان" امراوتی بابت جنوری ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں شائع ہوا تھا کافی و وافی مدد لی گئی ہے۔ (بریلوی)

ڈاکٹر محمد شفیع

(۱۹۶۳ء)

سابق پنجاب کا مردم خیز شہر لاہور ہمیشہ سے چوٹی کے اہل علم کا مرکز رہا ہے۔ اب بھی وہاں بڑی بڑی معرکے کی شخصیتیں موجود ہیں۔ انہی میں پروفیسر ڈاکٹر محمد شفیع کی بلند پایہ شخصیت تھی۔ جن کا المناک حادثۂ ارتحال ابھی حال ہی میں پیش آیا ہے۔ آپ کے انتقال سے علمی دنیا میں ایک ایسا خلا واقع ہوا ہے کہ اُس کا پُر کرنا آسان نہ ہوگا۔ ڈاکٹر شفیع کافی عرصہ تک مشہور اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل رہے اور اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد گذشتہ بارہ چودہ سال سے پنجاب یونیورسٹی کے تحت اس کے ایک شعبۂ تحقیق علمی کے سربراہ کی حیثیت سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے انگریزی سے اُردو میں ترجمہ مع تعلیقات وحواشی و ترتیب جدید کے اہم کام میں مصروف تھے۔ یہ ایک انتہائی مفید کام ہے جس کو وہ اپنی بصیرت علمی اور تاریخی بالغ نظری سے کام لے کر بہت خوبی اور مستعدی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ افسوس ہے کہ اُن کی زندگی نے وفا

نہ کی اور یہ کام ان کے ہی ہاتھوں تکمیل پذیر نہ ہوسکا۔ اب یہ ذمہ داری ان کے جانشینوں کی ہے کہ اس کو جلد از جلد تکمیل کریں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ اپنی رحمت سے مرحوم پروفیسر شفیع کی خدماتِ علمی و اسلامی کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اُن کی پاک روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

(آمین)

ڈاکٹر سید ہادی حسن

اور

مولوی محمد سلیمان بدایونی

(۱۹۶۳ء)

شوکت تھانوی مرحوم کی المناک موت کا زخم ابھی مندمل نہیں ہوا تھا کہ ۲۳ رمئی ۱۹۶۳ء کو جناب ڈاکٹر سید ہادی حسن صاحب سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے انتقال پُرملال کی خبر ملی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک انتہا درجہ بجیلی شخصیت کے مالک تھے شکیل و وجیہ جامہ زیب، پھر اس پر انگریزی و فارسی میں بے نظیر قوتِ حافظہ کے ساتھ جادو بیانی! سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی قسم کے ایک نرالے انسان تھے۔ علمی اور تحقیقی میدان میں اُن کی بہت سی معنوی یادگاریں ہیں۔

دوسری المناک موت جناب مولوی محمد سلیمان بدایونی کی یکم جون ۱۹۶۳ء کو مکہ معظمہ میں ہوئی جہاں موصوف حج بیت اللہ کی سعادت

حاصل کرنے کے لئے گئے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم شرفائے بدایوں میں ایک نمایاں شخصیت کے مالک اور بڑے وضع دار انسان تھے۔ آپ کی ولادت ۲۷ رجنوری ۱۸۸۹ء کو ہوئی۔

آپ تاریخ اور اسلامیات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ کے تحقیقی مقالات "العلم" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کی پُرخلوص محبت اور ہمدردی ملی سے کوئی شخص متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا اللہ تعالیٰ ہر دو مرحومین کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد

([illegible])

ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد ایک متوسط الحال خاندان کے فرد تھے اور ان کو اپنے زمانۂ طالب علمی میں اُن تمام مشکلات سے گزرنا پڑا جن سے اس طبقہ کے بچوں کو گزرنا ہوتا ہے، لیکن خداداد ذہانت، شدید محنت اور خوش بختی کی بدولت وہ زمانۂ تعلیم کے ہر امتحان میں نمایاں امتیازات کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے۔ بی۔ اے کے بعد ان کے اعلیٰ تعلیمی نتائج کی بنا پر ان کو ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ پیش کیا گیا جو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے لئے بہت زیادہ فخر کی بات تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے سرسید علیہ الرحمۃ اور اپنے اُستادوں کے مشوروں پر عمل کر کے اعلےٰ تعلیم کو جاری رکھا اور علی گڑھ میں اختتام تعلیم کے بعد اپنی مادرِ علمی ہی میں ریاضی کے پروفیسر ہو گئے۔ فنِ ریاضی میں ان کے کمالات، دِن بدن کھُلتے رہے جس کی بنا پر اکابرین علی گڑھ نے یہ مُناسب سمجھا کہ ان کو تعلیم کے لئے ولایت بھیج دیا جائے۔ ولایت میں وہ ہر قسم کی تفریحات سے علیحدہ رہے اور اپنی توجہ کو تمام تر حصولِ علم پر مبذول رکھا جس کے نتیجے میں پی، ایچ، ڈی تو معمولی چیز ہے ریاضی میں اس

سے بھی اعلیٰ ایسی ڈگریاں حاصل کیں جن کا برصغیر پاک و ہند میں اس وقت شاید ہی کوئی دوسرا شخص حامل تھا۔ حصولِ علم کے ان فقید المثال کارناموں کو انجام دے کر جب ہندوستان واپس لوٹے تو دارالعلوم علی گڑھ اور ان کا ملک ان کی عزت افزائی کے لئے چشم براہ تھا۔ چنانچہ جس وقت وہ علی گڑھ اسٹیشن پر پہنچے تو ایم۔ اے۔ او کالج کے تمام اساتذہ، طلبا، ٹرسٹی صاحبان، اور عہدہ داران ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ سر سے پاؤں تک اُن کو ہاروں اور پھولوں سے لاد دیا گیا۔ اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے کاندھوں پر اُٹھا کر باہر لایا گیا اور کالج تک جو قریب ایک میل کا فاصلہ ہے، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور مثل اُن کے دوسرے اکابر اُن کی گاڑی کو گھوڑے کھول کر اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر لائے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کو ایم۔ اے۔ او کالج کا پرنسپل بنایا گیا جو اس اعتبار سے سب سے بڑا اعزاز تھا کہ وہ مادرِ علمی کے سب سے پہلے فارغ التحصیل فرزند اور مسلمان تھے جنھوں نے مسٹر بیک۔ مسٹر موریسن اور مسٹر آرنلڈ جیسے نامور انگریز پرنسپلوں کی جگہ حاصل کی۔ پرنسپل کے عہدے کو ڈاکٹر صاحب نے اس طرح نہیں سنبھالا جس طرح کہ عام طور پر ہمارے کالجوں کے پرنسپل ہوتے ہیں، اُنھوں نے اپنے آپ کو سرسید اور اُن کے نامور جانشین محسن الملک اور نواب اسحاق خاں صاحب کی ہمہ گیر تعلیمی و اصلاحی تحریک کا علمبردار اور موثر ترین منّاد بنایا۔ وہ صرف پرنسپل نہیں تھے بلکہ تمام طالب علموں کے روحانی باپ اور صحیح معنیٰ میں ایک ایسے معمار قوم تھے جن کے فیضِ تربیت سے سینکڑوں کی تعداد میں اعلےٰ درجہ کے رہنمایانِ قوم پیدا ہوئے جنھوں نے قیامِ پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد

اب تک نہ صرف ہر دو ممالک کی تحریک آزادی کو چلایا بلکہ ان کے نظم و نسق کے بہت بڑے ستون ثابت ہوئے۔

ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد دن رات کام کرنے کے عادی تھے تعطیلات اور فرصت کے تمام اوقات علی گڑھ کالج کے مفاد کے لئے سفر میں گزارتے تھے، سفر ہو یا حضر علی الصباح ہر موسم میں پانچ بجے بستر چھوڑ کر اپنی کوٹھی یا قیام گاہ کے احاطے میں تیز تیز چہل قدمی کرتے اور اسی وقت جن لوگوں کو ان سے اہم اور ضروری کام ہوتے ان کو ملاقات کا موقع دیتے تھے ٹہلتے جا رہے ہیں اور مفید مشورے دے رہے ہیں۔ اسی نہج پر صبح سے رات کے گیارہ بجے تک وہ اپنے اوقات عزیز کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرتے اور بیچ بیچ میں جب آرام و سکون حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے لئے وہ نیند بھی لے لیتے تھے۔ اکثر دیکھا گیا کہ اسٹریچی ہال یا اسٹوڈنٹس یونین میں ان کی صدارت میں ہنگامہ خیز جلسہ ہو رہا ہے پُر زور تقریریں جاری ہیں اور وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اتنی دیر کے لئے سو گئے جتنی دیر کے لئے انھوں نے مقرر کی تقریر کو اپنے نقطہ نظر سے زیادہ اہم نہ سمجھا اور اس طرح سو کر وہ اپنے جسم و دماغ کو تازہ دم کر لیا کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور عالی جناب سر محمد علی محمد خاں راجہ آف محمود آباد اس کے پہلے وائس چانسلر اور ڈاکٹر صاحب پرو وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس ازدیادِ اعزاز کے ساتھ ہی ساتھ ڈاکٹر صاحب

کے خلاف منظم مخالفت کے دور کا بھی آغاز ہوا اور پہلا حملہ یونیورسٹی پر کانگریسی اور خلافتی مسلمانوں کی جانب سے گاندھی جی کی قیادت میں مسلم یونیورسٹی کو نیشنل یونیورسٹی بنانے کے لئے کیا گیا۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب شروع سے سر سید علیہ الرحمۃ کی تقلید میں مسلمانوں کی قومی انفرادیت اور برصغیر پاک و ہند میں دو قومی نظریہ کے حامی تھے اس لئے انھوں نے ڈٹ کر اس یورش کا مقابلہ کیا اور دنیا پر ثابت کر دیا کہ سیاست میں بھی وہ اپنا جواب اور ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ سیاست سے ہم آغوش ہونے کی ابتدا اسی وقت سے ہوئی لہٰذا انھوں نے انٹیگو چیمس فورڈ اصلاحی اسکیم کے تحت صوبائی اسمبلی کی رکنیت اور اس کے بعد سنٹرل اسمبلی کی رکنیت دھوم دھام سے الیکشن لڑ کر حاصل کی۔ اپنے انھیں انتخابات میں اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کی انتخابی مہموں میں انھوں نے اپنے طلبا اور اساتذہ کو الیکشن لڑنے کا فن سکھایا اور ان تربیت یافتہ ماہرین نے ڈاکٹر صاحب کے بتلائے ہوئے گُروں کو کام میں لا کر آئندہ قیام پاکستان کے سلسلے کے الیکشنوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں سنہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک بہت سے انقلابات آئے ان کی مرضی کے اور ان کی مرضی کے خلاف لوگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، پرو چانسلر، چانسلر، ریکٹر اور لارڈ ریکٹر بنتے اور ہٹتے رہے جس کے نتیجے میں خود ان کا یونیورسٹی سے کئی بار قطع تعلق کافی کافی عرصہ کے لئے ہوتا رہا لیکن "علی گڑھ اور ڈاکٹر ضیاءالدین" نہ کبھی ایک

دوسرے سے جُدا رہے اور نہ کسی نے ان کو علیحدہ سمجھا، ان کا باہمی تعلق اس مشہور شعر کا مصداق تھا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

اسی حال پر ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو وہ منحوس اور نہ ٹلنے والا وقت آیا کہ ڈاکٹر صاحب کا لندن میں چند ہفتہ علالت کے بعد انتقال ہوگیا جس کی خبر ہند و پاکستان میں بجلی کی سی تیز رفتاری کے ساتھ پھیل گئی اور ان کے عقیدت مند تو عقیدت مند، ان کے بدترین مخالف بھی کلیجہ تھام کر رہ گئے کہ افسوس کیسا انمول ہیرا ملت اسلامیہ کے ہاتھ سے نکل گیا اور علم و فن کا کتنا بڑا روشن ستارہ غروب ہوگیا۔ ان کی نعش کو حنوط کر کے ایک بکس میں سمندری جہاز سے بمبئی لایا گیا اور بمبئی سے مسٹر عبدالباری (مرحوم) حال مقیم کراچی اُسے علی گڑھ لائے۔ علی گڑھ اسٹیشن سے میت کو یونیورسٹی تک جس طرح لے جایا گیا اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ یونیورسٹی کے طلبا، اساتذہ اور اہل شہر کے کتنے عظیم ہجوم نے اس کی مشایعت کی اور یونیورسٹی کے مشہور کرکٹ لان میں کتنے زبردست اجتماع نے نماز جنازہ پڑھی جس کے بعد اُن کے روئے منور کی زیارت کے لئے کرکٹ پویلین پر کس طرح ہجوم پروانہ وار گر رہا تھا اور لوگ چیخیں مار مار کر رو رہے تھے۔ درمیان عصر و مغرب ڈاکٹر صاحب کو ان کے صحیح مقام یعنی سرسید علیہ الرحمہ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ اُس دن کی یاد آج تک لوگوں کے دلوں میں تازہ ہے۔ ؏

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

"العلم"

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کا

سہ ماہی رسالہ

زیر ادارت

مشہور ماہر تعلیم اور مصنف و ادیب مولوی سید الطاف علی بریلوی

بی۔ اے (علیگ)

اس رسالہ میں مملکت پاکستان کی تعلیمی ترقی اور ثقافتی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مشاہیر اہل قلم کے لکھے ہوئے علمی اور تاریخی مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں۔ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی علمی و ادبی جد و جہد کے متعلق معلومات درج ہوتی ہیں۔ عوام کی واقفیت کو وسیع تر کرنے کے لئے دلچسپ خبریں اور تبصرے ہوتے ہیں۔ چندہ آٹھ روپے سالانہ۔ کانفرنس کو کم از کم دس روپے سالانہ چندہ ممبری دینے والے حضرات کی خدمت میں رسالہ مفت پیش کیا جاتا ہے۔

دیگر مطبوعات کانفرنس اکیڈمی

سعیدہ منزل متصل سرسید گرلس کالج بی روڈ ناظم آباد

کراچی

کتاب	قیمت
۱۔ "گلشن بے خار"، مصنفہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ۔ ترجمہ معہ حواشی و تعلیقات از سید احسان الحق فاروقی ایم اے۔	بارہ روپے
۲۔ "مشرقی و مغربی تہذیب" مصنفہ ڈاکٹر احسان محمد خاں ایم اے پی ایچ ڈی	3/-
۳۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں، مولفہ علامہ سید سلیمان ندوی۔ انگریزی ترجمہ از مرزا عاشق حسین ایم اے۔ ڈاکٹر زبید احمد ایم اے پی ایچ ڈی	2/50
۴۔ " " بنگالی ترجمہ از مولانا غلام محی الدین ایڈیٹر آج ڈھاکہ	3/-
۵۔ مسلم خواتین کی تعلیم۔ مولفہ مولوی محمد امین زبیری مرحوم۔	2/-
۶۔ اسلامی نظام تعلیم، مولفہ پروفیسر سعید احمد رفیق ایم اے	3/-
۷۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات، مولانا اعجاز الحق قدوسی تعارف از ڈاکٹر اینی میری شمیل پروفیسر بون یونیورسٹی	10/-
۸۔ علمائے سلف و نابینا علماء۔ تصنیف نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی تعلیقات و حواشی مفتی انتظام اللہ شہابی و ڈاکٹر شجاع الحق صدیقی ایم اے	9/-
۹۔ اردو زبان اور اسالیب۔ تصنیف سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی مقدمہ از جناب ممتاز حسن صاحب	9/-

۱۰۔ حکیم عمر خیام۔ تالیف ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی صاحب۔ مقدمہ از سید الطاف علی بریلوی 2/50

۱۱۔ خط و خطاطی۔ مصنفہ شیخ ممتاز حسین جون پوری و محمد ایوب قادری ایم اے 1/50
مقدمہ از جناب ڈاکٹر زبید احمد ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

۱۲۔ ذکر و فکر۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔ مقدمہ از جناب انعام عظیم برنی ایم اے 0/75

۱۳۔ پاکستان کا معاشی پس منظر۔ مصنفہ سیدہ انیس فاطمہ بریلوی۔ پیش لفظ از 3/50
ڈاکٹر سید ظہیر الدین ایم۔ اے۔ ڈی لٹ۔

۱۴۔ چند عظیم علمائے جرائم۔ انگریزی تصنیف ماکروب ہنٹرز کا اردو ترجمہ 10/-
از پروفیسر عبد المجید قریشی۔

۱۵۔ تعلیمی نفسیات کا بنیادی خاکہ۔ از پروفیسر حمید الحق صدیقی سابق پرنسپل 4/-
ٹریننگ کالج علی گڑھ و سید منیر الدین احمد ایڈوکیٹ

۱۶۔ علم و عمل (جلد اول) فارسی تصنیف وقائع عبد القادر خانی کا اردو ترجمہ 8/-
از مولوی معین الدین افضل گڑھی ترتیب و حواشی از
محمد ایوب قادری ایم اے تعارف از نواب صدر یار جنگ
مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔

۱۷۔ " " (جلد دوم) " " " " 8/-

۱۸۔ جان ڈوی کا فلسفہ تعلیم۔ ڈاکٹر رو رتھ اسپنس آرٹ کی تالیف جان ڈیویز 2/50
فلاسفی آف ایجوکیشن کا اردو ترجمہ از سید عین الدین علوی ایم۔ اے

۱۹۔ مقدر انسانی۔ لی کامت دو نوائے کی تصنیف ہیومن ڈسٹنی کا 8/-
اردو ترجمہ از پروفیسر عبد المجید قریشی ایم اے

۲۰۔ رومن رسم الخط اور پاکستان۔ مصنفہ مولانا سید عبد القدوس ہاشمی ندوی 0/50

۲۱۔ قدیم شہنشاہیاں۔ مصنفہ مولانا سید طفیل احمد منگلوری (علیگ) 3/

۲۲۔ اصول و اساس تعلیم۔ (سر پرسی نن کی عالمانہ تصنیف ایجوکیشن اٹس ڈیٹا 7/-
اینڈ فرسٹ پرنسپلس کا اردو ترجمہ) از انعام عظیم برنی، اخلاص حسین
ایم اے۔ محمد حسین خاں زبیری ایم اے و سید بدر الحسن اور
سید اظہر حسین رضوی ایم۔ اے۔

۲۳۔ اصول تدریس۔ (رائبرن اور فورج کی کتاب پرنسپلس آف ٹیچنگ 5/-
کا اردو ترجمہ از اخلاص حسین ایم اے۔

۲۴۔ حیات مابعد۔ مصنفہ سید ضامن حسین نقوی گویا جہان آبادی۔ 3/50

۲۵۔ مکاشفات کشفی۔ مصنفہ خان بہادر مرزا ابو جعفر کشفی 3/-

۲۶۔ تجدد امثال۔ مصنفہ سید ضامن حسین نقوی گویا جہان آبادی۔ 2/-

۲۷۔ طالب علم کی ڈائری۔ مصنفہ سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ) 3/-

۲۸۔ مقاصد تعلیم۔ اے این وہائٹ ہیڈ کی تصنیف "ایمس آف
ایجوکیشن" کا اردو ترجمہ (از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ جنگ کراچی۔

۲۹۔ ارتقائے انسانی۔ (جدید سائنس کی روشنی میں) مؤلفہ مولانا 2/-
سید طفیل احمد منگلوری (علیگ)

۳۰۔ جمہوریت اور تعلیم (حصہ اول) جان ڈیوی کی تصنیف "ڈیماکریسی اینڈ ایجوکیشن" کا 5/-
اردو ترجمہ از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ جنگ کراچی

۳۱۔ " " (حصہ دوم) " " " " " 5/-

۳۲- پراسرار کائنات۔ (سر جیمس جینس کی کتاب "میسٹریس یونیورس" کا اردو ترجمہ) 6/-
از سید محمد تقی ایڈیٹر روزنامہ "جنگ" کراچی۔

۳۳- مشاہیر کے تعلیمی نظریے۔ مؤلفہ محمد حسین خاں زبیری ایم۔ اے (علیگ) 4/-

۳۴- مادری زبان کی تعلیم۔ مصنفہ پروفیسر یونس حسن "فروغ" 3/-
علوی۔ ایم۔ اے۔

۳۵- ثقافت و انتشار۔ (میتھو آرنلڈ کی شہرۂ آفاق کتاب "کلچر اینڈ 6/-
انارکی" کا اردو ترجمہ) از انعام عظیم برنی
ایم۔ اے و اخلاص حسین ایم۔ اے۔

۳۶- "نقدِ ادب"۔ ل۔ احمد اکبر آبادی۔ مقدمہ از جناب مخمور اکبر آبادی۔ 3/-

۳۷- عظیم علمائے نفسیات۔ اردو ترجمہ "گریٹ سائیکالوجسٹس" ۱۲/-
مصنفہ ایس۔ سارجنٹ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مترجمہ پروفیسر عبدالمجید قریشی

۳۸- نواب خان بہادر خاں شہید۔ مؤلفہ سید مصطفےٰ علی بریلوی بی۔ کام۔ 1/50

۳۹- حیات حافظ رحمت خاں۔ مؤلفہ سید الطاف علی بریلوی۔ بی۔ اے (علیگ) ۱۰/-

۴۰- لائف آف حافظ رحمت خاں۔ مترجمہ پروفیسر محمد حامی الدین خاں ایم۔ اے۔ ۲۰/-

۴۱- رفقائے عظیم۔ میکس ایسٹ مین کی تصنیف "گریٹ کمپینینس" از ۱۰/-
پروفیسر محمد حامی الدین خاں۔ ایم۔ اے۔

۴۲- تعلیماتِ حضرت شاہ مینا۔ مؤلفہ الحاج محمد خصلت حسین صابری 3/-
بی۔ اے (علیگ)

۴۳- ہسٹری آف مسلم ایجوکیشن۔ (جلد اول) زیرِ تکمیل۔

" RAHI - AUR - RAHNUMA "

(LAYMAN AND THE LEADER)

BY

SYED ALTAF ALI BRELVI,

B.A., (ALIG.)

AUTHOR OF

The "Life of Hafiz Rahmat Khan", "The Diary of a Student" and "The struggle of Muslims in Education" etc.

Price

Academy of Educational Research
All Pakistan Educational Conference
KARACHI
1964